غزل اور نظم کے شاعروں کے تعارف سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ تمام دور اہل علم کا رہا اور انہیں اقبال کی غزلوں اور نظموں نے حد درجہ متاثر کیا اور خود اقبال اپنے معاصر شعرا سے حد درجہ یگانگت رکھتے تھے۔ اقبال کے خطوط اس قول کی تصدیق کرتے ہیں کہ اقبال نے اپنے ہمعصر شعرا سے رابطہ قائم کرنا ضروری سمجھا۔ اقبال کی شخصیت کا یہ بھی ایک اہم پہلو ہے کہ انہوں نے معاصرانہ چشمک کو خاطر میں نہ لا کر اردو شاعری کی تاریخ کو ایک نیا موڑ دیا ہے۔

24.6 نمونہ امتحانی سوالات

ذیل کے سوالوں کے جواب تیس تیس سطروں میں دیجیے:

1. عہد اقبال کی غزل گوئی کے بارے میں آپ کیا جانتے ہیں؟
2. عہد اقبال کے چند اہم نظم نگار شعرا کا تعارف کروائیے۔
3. عہد اقبال کی اردو شاعری کا اجمالی جائزہ لیجیے۔

ذیل کے سوالوں کے جواب پندرہ پندرہ سطروں میں دیجیے:

1. علامہ اقبال کی غزل گوئی کی خصوصیات بیان کیجیے۔
2. عہد اقبال کے کن ہی دو غزل گو شاعروں کا تعارف کروائیے۔
3. عہد اقبال کے کن ہی دو نظم نگار شعرا کے بارے میں اظہار خیال کیجیے۔

24.7 فرہنگ

محروم = نہ پانے والا
متقاضی = تقاضہ کرنے والا
حضر = ایک جگہ قیام، سفری قید
رجحان = میلان، توجہ
مخزن = خزانہ، گودام
سرکوبی = سزا دینا، سر کچلنا
تلمذ = شاگرد ہونا
گیسو = زلف، لٹ، بال
افتاد = مصیبت، اچانک سانحہ
منسوخ = رد کیا گیا، نابود
قرائن = قرینہ کی جمع، سلیقہ
تلامذہ = تلمیذ کی جمع، شاگرد
نامساعد = ناموافق، ناہموار
معیت = ساتھی۔ ہمرہی
فیضان = فائدہ پہنچنا، فیض کی جمع
دشت = جنگل، صحرا

درون = اندرونی حصہ
ماند = چمک کم ہونا
رزمیہ = جنگی داستان
ہم عصر = ایک وقت یا زمانے کے
تقریظ = تعریفی تحریر برائے کتاب یا مصنف
پیروی = تقلید، نقل
مسدود = بند کیا گیا، بند
گریباں = پوشاک کا اوپری حصہ
یاسیت = ناامیدی، مایوسی میں اضافہ
مواضع = موضع کی جمع، دیہات
گور = قبر، تربت، مزار
ہدف = نشانہ، زد
معقولات = علم حکمت، فلسفہ، منطق
ہمسر = برابر کا، ہم رتبہ
رموز = رمز کی جمع، راز کی باتیں
مہمیز = جانور کو ایڑ لگانے کے لیے استعمال ہونے والا کانٹا

مژدہ	=	خوشی، خوش خبری	اسیر	=	گرفتار، قیدی
فسوں	=	جادو، فریب، مکر	گشتہ	=	پھرنا، چکر، گھومنا
صہبا	=	ایک قسم کی لال شراب	احمر	=	سرخ
غنچہ	=	پھول کی کلی، شگوفہ	نغمہ زن	=	گانے والا
مہر	=	محبت، دوستی، سورج، رحم	تاباں	=	روشن، نورانی
ہم صفیر	=	ہمدم، ساتھی، دوست	مضراب	=	ستار بجانے کا چھلہ

24.8 سفارشی کردہ کتابیں

.1	ڈاکٹر تسکینہ فاضل	اقبال اور ان کے معاصر شعرا و ادبا
.2	ڈاکٹر سید اعجاز حسین مرمہ ایڈیشن (عقیل رضوی)	مختصر تاریخ ادب اردو
.3	پروفیسر سیدہ جعفر	تاریخ ادب اردو (میر تا ترقی پسند تحریک) (جلد سوم، چہارم)
.4	رام بابو سکسینہ	تاریخ ادب اردو
.5	طاہر تونسوی	اقبال اور مشاہیر
.6	پروفیسر سید وقار عظیم	اقبال معاصرین کی نظر میں
.7	ڈاکٹر سلیم اختر	اقبالیات کے نقوش
.8	ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار	اکبر اور اقبال
.9	بشیر احمد ڈار	انوارِ اقبال

اکائی: 25 اُردو نثر عہد اقبال میں

ساخت

25.1 تمہید

25.2 عہد اقبال کی نثر

25.3 عہد اقبال کی افسانوی نثر

25.3.1 عہد اقبال میں ناول نگاری

25.3.2 عبدالحلیم شرر لکھنوی

25.3.3 راشد الخیری

25.3.4 مرزا محمد ہادی رسوا

25.3.5 منشی فیاض علی ایڈوکیٹ

25.4 عہد اقبال میں مختصر افسانہ

25.4.1 منشی پریم چند

25.4.2 سجاد حیدر یلدرم

25.4.3 سدرشن

25.4.4 علی عباس حسینی

25.5 عہد اقبال میں اردو ڈراما

25.5.1 آغا حشر کاشمیری

25.5.2 حکیم احمد شجاع

25.5.3 سید مہدی حسن احسن

25.5.4 نرائن پرشاد بیتاب

25.5.5 امتیاز علی تاج

25.6 عہد اقبال میں غیر افسانوی نثر

25.6.1 مولانا ابوالکلام آزاد

25.6.2 نیاز فتح پوری

25.6.3 مہدی افادی

25.6.4 ظفر علی خاں

25.6.5 عبدالماجد دریابادی

25.6.6 مولوی عبدالحق

25.6.7 قاضی عبدالغفار

25.6.8 خواجہ حسن نظامی

25.6.9 برج موہن دتاتریہ کیفی

25.6.10 سید سلیمان ندوی
25.7 عہد اقبال میں طنز و مزاح
25.7.1 ملا رموزی
25.7.2 مرزا فرحت اللہ بیگ
25.7.3 شوکت تھانوی
25.7.4 پطرس بخاری
25.7.5 عظیم بیگ چغتائی
25.7.6 رشید احمد صدیقی
25.8 خلاصہ
25.9 نمونہ امتحانی سوالات
25.10 فرہنگ
25.11 سفارش کردہ کتابیں

25.1 تمہید

اقبال کے دور تک پہنچتے پہنچتے اردو نثر کو اس کا فطری اسلوب حاصل ہو چکا تھا۔ سادہ اور عام نثر کو مقبولیت حاصل ہو چکی تھی۔ داستانوں کی مسجع اور مقفی نثر اور رنگین بیانی آہستہ آہستہ دم توڑ رہی تھی۔ ادب لطیف اور رومانی نثر کو شہرت حاصل ہو رہی تھی جس کے ساتھ ہی مرزا غالب اور سرسید کی نثر کو فطری نثر کا درجہ حاصل ہو چکا تھا۔ اردو نثر عمومی طور پر افسانوی اور غیر افسانوی اصناف پر مشتمل تھی جس کے ساتھ ہی صحافت کے توسط سے صحافی نثر کا احیا ہونے لگا تھا۔ قصہ کہانی بیان کرنے کی نثر کو ڈپٹی نذیر احمد کی تحریروں سے فروغ حاصل ہو چکا تھا اور قصہ کہانی کے بجائے دنیا کی حقیقتوں کے اظہار کے لیے غیر افسانوی نثر کی مختلف اصناف کا عام رواج ہونے لگا تھا۔ علمی کتابوں کی تحریر کے ذریعے سائنسی اور تکنیکی علوم و فنون کی پذیرائی عام ہونے لگی تھی۔ اسی طرح ترجمے کے توسط سے مغربی ادبیات اور علوم و فنون کے ذخیرے اردو میں منتقل ہو رہے تھے۔ اس اعتبار سے اقبال کے عہد کو اردو نثر کی ترقی کا ہمہ جہتی دور کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا کیونکہ اس دور میں ہر شعبۂ حیات سے اردو نثر کا رابطہ مستحکم ہو چکا تھا۔ افسانوی، غیر افسانوی، صحافتی اور علمی نثر کے علاوہ ترجمے کے ذریعے بھی نثر کی مکمل ترجمانی ہونے لگی۔ سنجیدہ کے علاوہ مزاحیہ اور طنزیہ نثر کو فروغ حاصل ہوا۔ اس طرح اقبال کے عہد میں اردو نثر ہر جہت کے عمدہ اظہار کا وسیلہ بن گئی۔ ایسی مایہ ناز تحریروں کی پیش کش کے لیے اقبال کے دور کے نثر نگاروں کے کارناموں کو بہر حال قدر کی نگاہ سے دیکھا جائے گا۔

علامہ اقبال کی نثر کو ''غیر افسانوی نثر'' کی حیثیت حاصل ہے۔ انھوں نے اپنی طالب علمی کے زمانے میں ''تصوف'' پر مقالہ لکھا۔ پھر انھوں نے Reconstruction of Islamic Thoughts پر انگریزی میں لکچر دیے۔ لکچر یا خطبہ کو بھی غیر افسانوی نثر میں شامل کیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ اقبال کے خطوط کو اردو نثر میں خاص مقبولیت حاصل ہے۔ خطوط اقبال کے مختلف مجموعے مختلف ادوار میں شائع ہوتے رہے اور اب مظفر حسین برنی نے کلیات مکاتیب اقبال'' چار جلدوں میں شائع کر دیا ہے جو اقبال کے تمام خطوط کا انتخاب ہے۔ جن کے مطالعے سے اقبال کی توضیحات و تشریحات کے علاوہ ان کی تفہیم و ترسیل کی صلاحیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ اقبال نے تمام عمر غیر افسانوی نثر کی نمائندگی کی اور ان کے بعض خطوط میں سفر نامہ کا انداز بھی جھلکتا ہے چنانچہ انھوں نے افغانستان کے جامعاتی نصاب کی ترتیب کے دوران جو سفر پاکستان سے افغانستان تک کیا تھا۔ اسے مکتوباتی سفر نامہ کی صورت میں پیش کیا ہے۔ اسی طرح اقبال کے خطوط میں صحافت کے انداز اور روداد نویسی Reporting کی جھلکیاں بھی دکھائی دیتی ہیں۔ خطوط اقبال بنیادی طور پر غیر افسانوی نثر کے نمائندہ ہیں لیکن یہ خطوط ہونے کے ساتھ ساتھ یادداشت، روزنامچہ، روداد اور سفر نامہ کے علاوہ سوانحی اور خودنوشت طرز نثر کی نشاندہی بھی کرتے ہیں۔

21.2 عہد اقبال کی نثر

سر محمد اقبال کے تمام تر شعوری دور کو بیسویں صدی کی ابتدائی تین دہائیوں کے دور سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ اس دور میں علمی و ادبی ہی نہیں بلکہ تخلیقی، افسانوی، غیر افسانوی نثر اور ترجمے کو فروغ حاصل ہوا۔ فلسفہ، منطق، عمرانیات، مذہبیات اور دیگر علوم وفنون پر بے شمار علمی کتابیں شائع ہونے لگیں۔ دارالمصنفین اعظم گڑھی یوپی کے توسط سے مذہبیات میں تحقیقاتی نثر کا احیا ہوا۔ سائنٹفک سوسائٹی کے توسط سے سائنسی علوم کی کتابوں کے اردو میں ترجمہ کی روایت کا آغاز کیا گیا تھا۔ 1917ء میں دارالترجمہ عثمانیہ حیدرآباد کے قیام کی وجہ سے علوم سائنس جیسے کیمیا، طبیعیات، نباتیات، حیوانات پر اردو میں نصابی کتب شائع ہونے لگیں۔ طب (میڈیسن) انجینرنگ قانون اور علوم عمرانیات پر دارالترجمہ جامعہ عثمانیہ سے ترجمہ شدہ کتب کی اشاعت سے عہد اقبال کی نثر میں انقلاب پیدا ہوا۔ عہد اقبال میں جہاں علمی نثر کو فروغ حاصل ہوا اور تحقیقات کے دروازے کھل گئے وہیں ادبی نثر میں بھی تبدیلی رونما ہوئی۔ ناول، افسانہ، ڈراما اور ناولٹ لکھنے والے نثر نگاروں کی اقبال کے عہد میں کمی نہیں رہی۔ اسی طرح سوانح، خودنوشت، آپ بیتی، سفرنامہ، رپورتاژ، خاکہ، تحقیق، تنقید اور مکتوب نگاری جیسی اصناف کو شہرت حاصل ہوئی۔ اقبال کے عہد کی نثر میں صحافت کی وجہ سے تبدیلی رونما ہوئی۔ صحافت کے توسط سے اداریہ نویسی، روداد نویسی، کالم نویسی کی روایت کا آغاز ہوا۔ اخبارات اور رسائل میں خطوط کی اشاعت نے مراسلاتی نثر کو بھی فروغ دیا۔ غرض اقبال کے دور تک اردو نثر کی ہمہ جہت ترقی ہوئی۔ عربی، فارسی اور ترکی میں لکھی ہوئی تخلیقات کے ترجمے کا سلسلہ جاری تھا۔ ان مشرقی زبانوں کے علاوہ انگریزی، فرانسیسی، جرمن اور روسی زبان معرکتہ الآرا تصانیف کے اردو ترجموں کی وجہ سے مغربی زبانوں کی ترجمانی کا حق ادا ہوا۔ اس طرح اقبال کے عہد کی نثر میں ترجمہ کی نثر کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ ان کے عہد میں شعری اور نثری ترجمے کی روایت نے وسعت اختیار کر لی۔ اس لیے اقبال کے عہد کو نثری کارناموں کا ایک زریں دور قرار دیا جائے تو بیجا نہ ہوگا کیونکہ اس دور میں اردو نثر افسانوی اور غیر افسانوی اصناف سے ہی وابستہ نہیں رہی بلکہ علمی نثر، تحقیقاتی نثر، صحافتی نثر، مراسلاتی نثر اور ترجمہ کی نثر سے وابستہ ہو کر نثر کی ہمہ جہت ترقی کا حق ادا کرنے لگی۔

اپنی معلومات کی جانچ:

1. عہد اقبال کی نثری اصناف کے نام لکھیے۔
2. عہد اقبال کی نثر کی قسمیں کیا ہیں؟

25.3 عہد اقبال کی افسانوی نثر

علامہ اقبال نے جس عہد میں اپنی صلاحیتوں کو پروان چڑھایا۔ اس پورے دور میں افسانوی نثر کا بول بالا تھا۔ ڈپٹی نذیر احمد، رتن ناتھ سرشار، عبدالحلیم شرر، راشد الخیری، منشی فیاض علی، مرزا محمد ہادی رسوا کی ناول نگاری عروج پر تھی۔ ان ناول نگاروں کے قافلے نے افسانوی نثر کو پروان چڑھایا۔ داستانوی نثر دم توڑ رہی تھی۔ ناول نگاری کی نثر کے ساتھ افسانہ نگاری نے سر ابھارنا شروع کر دیا تھا۔ پریم چند، سدرشن، سجاد حیدر یلدرم، اعظم کریوی اور علی عباس حسینی جیسے افسانہ نگاروں نے عہد اقبال میں کہانی یا افسانہ نگاری کے توسط سے افسانوی نثر کے فروغ میں حصہ لیا جب کہ عہد اقبال میں ڈرامے کی روایت امتیاز علی تاج سے فروغ پائی تاہم پریم چند (ڈراما کربلا) اور چکبست (ڈراما کملا) کی وجہ سے بھی ڈرامے کی ترقی کا ماحول پیدا ہوا۔ اس طرح اقبال کے عہد میں ناول، افسانہ اور ڈراما جیسی اصناف کے ذریعے افسانوی نثر کو فروغ حاصل ہوا۔ اس عہد تک ''ناولٹ'' کی صنف کو فروغ حاصل نہ ہو سکا تھا۔

21.3.1 عہد اقبال میں ناول نگاری

اقبال کے عہد تک اردو ناول کا ارتقا عمل میں آچکا تھا۔ ڈپٹی نذیر احمد (وفات 1912ء) کے تمثیلی قصوں سے اردو ناول کا سفر شروع ہوا پھر عبدالحلیم شرر نے تاریخی ناول نگاری کی بنیاد رکھی۔ رتن ناتھ سرشار کے ناولوں میں لکھنوی زوال آمادہ تہذیب کی جھلکیاں محسوس کی جاسکتی ہیں۔ علامہ راشد الخیری نے غم انگیز ناولوں کے ذریعے اس صنف کو نئی جہت سے روشناس کرایا۔ منشی فیاض علی نے معاشرتی ناول کی بنیاد رکھی جب کہ مرزا رسوا کے ناول کے ذریعے طوائف کی زندگی کو بنیاد بنا کر ناول لکھنے کی روایت کا آغاز ہوا۔ منشی پریم چند کے ناولوں نے دیہاتی زندگی اور جدوجہد آزادی کی عکاسی کا کارنامہ انجام

دیا۔اسی دور میں نیاز فتح پوری نے رومانی ناول اور علی عباس حسینی نے سماجی ناول کی بنیاد رکھی۔اسی دوران انگریزی ناولوں کے اردو میں ترجمہ کی روایت کا بھی آغاز ہوا چنانچہ کئی سماجی، سیاسی، معاشرتی ناولوں کے علاوہ رومانوی، جاسوسی اور ہیبت ناک ناولوں کے ترجمے اردو میں کیے گئے۔اردو کے چند اہم ناول نگار اور ان کے کارناموں کا احاطہ ذیل میں پیش ہے۔

25.3.2 عبدالحلیم شرر

اردو میں ناول نگاری کو فنی اساس پر شروع کرنے کا سہرا عبدالحلیم شرر کے سر ہے۔انھیں اردو کے تاریخی ناول نگار کی حیثیت سے شہرت حاصل ہے۔لفظ ناول کو اردو میں رواج دینے اور اسلامی تاریخ کے اہم واقعات کو ناول کے انداز میں پیش کرنے میں انھیں کمال حاصل تھا۔ناول نگاری کے علاوہ آزاد نظم اور مضمون نگاری کی وجہ سے بھی انھوں نے نام کمایا۔لکھنؤ سے منفرد انداز میں رسالہ ''دلگداز'' شائع کیا۔وہ 1860ء میں اودھ دارالسلطنت لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔عمر میں علامہ اقبال سے سترہ سال بڑے تھے۔ایک مورخ، ڈراما نگار، صحافی، ادیب، ناول نگار اور شاعر کی حیثیت سے مشہور ہوئے۔شرر کے والد حکیم تفضل حسین عربی اور فارسی کے اعلیٰ تعلیم یافتہ تھے اور واجد علی شاہ کے ہاں ممتاز خدمت پر مامور تھے۔شرر جب 9 سال کی عمر کے ہوئے تو ان کے والد انھیں کلکتہ لے گئے۔یہیں پر ان کی ابتدائی تعلیم ہوئی۔سید علی حیدر طباطبائی سے منطق و فلسفہ پڑھا اور اسی زمانے میں مغربی علوم بھی حاصل کیے۔ حکیم محمد مسیح سے طب پڑھی اور چند دن مطب بھی کیا۔اقبال کی پیدائش کے وقت 1877ء میں 19 سال کی عمر میں لکھنؤ آئے اور نظم طباطبائی سے شاعری میں تلمذ حاصل کیا۔1881ء میں ''اودھ اخبار'' کے اسسٹنٹ ایڈیٹر مقرر ہوئے اور اپنی ادارت میں ایک ہفتہ وار رسالہ ''محشر'' نکالا'' پھر اودھ اخبار سے قطع تعلق کر کے پہلا ناول ''دلچسپ'' لکھا جو کافی مقبول ہوا۔1887ء میں رسالہ ''دلگداز'' جاری کیا جو ان کی زندگی تک جاری رہا۔1891ء میں حیدرآباد دکن تشریف لائے۔نواب وقار الامرا نے ریاست حیدرآباد سے دوسو روپے ماہوار وظیفہ مقرر کیا۔1895ء میں نواب وقار الامرا کے صاحبزادے کے ساتھ انگلستان گئے۔انگلستان سے واپسی کے چھ ماہ بعد حیدرآباد دکن سے لکھنؤ تشریف لائے۔عبدالحلیم شرر اردو ادب کی دنیا میں ایک چابکدست مصور، ناول نگار اور جذبات انسانی پر حکومت کرنے والے تخلیق کار تھے۔آپ کثیر التصانیف ادیب ہیں دسمبر 1926ء میں انتقال ہوا اور لکھنؤ میں دفن کیے گئے۔ ان کی تاریخی ناولوں کے نام درج ذیل ہیں۔

(1) ایام عرب (2) فتح اندلس (3) ماہ و ملک (4) یوسف و زلیخا (5) اومتہ الکبریٰ (6) مفتوح فاتح (7) فلپانا (8) فردوس بریں (9) قیس و لبنیٰ (10) لعبت چین (11) مقدس نازنین (12) جویائے حق (13) طاہرہ (14) مینا بازار (15) نیکی کا پھل (16) بابک خرمی (17) حسن انجلینا (18) فلورا فلورانڈا (19) ملک العزیز ورجینا (20) منصور و موہنا (21) آغا صادق کی شادی (22) حسن کا ڈاکو (23) خوفناک محبت (24) زوالِ بغداد (25) فسانہ تقیس (26) عزیزۂ مصر (27) ملکہ زنوبیہ (28) شیریں ملکہ عجم (29) غیب داں دلہن (30) دلچسپ (31) دلکش کامل (32) شہیدِ وفا (33) بدرالنساء کی مصیبت وغیرہ۔

ان ناولوں میں جہاں بہترین منظر نگاری، رومانویت اور دلچسپ انداز تحریر نمایاں ہے وہیں مسلمانوں کے جذبہ حریت اور جہاد کو بھی نمایاں کیا گیا ہے۔اقبال کی رحلت سے بارہ سال قبل شرر کا لکھنؤ میں انتقال ہوا تاہم عہد اقبال کے ناول نگار کی حیثیت سے ان کی خدمات کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

25.3.3 راشد الخیری

دہلی کے ایک ممتاز خاندان جسے شاہانِ مغلیہ کے استاد ہونے کا نسل در نسل فخر حاصل رہا ہے۔اسی خاندان سے علامہ راشد الخیری کا تعلق ہے۔ان کی پیدائش بمقام دہلی 1870ء میں ہوئی ابھی نو۔دس برس کے تھے کہ باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ان کی ابتدائی تعلیم دادا اور چچا کی نگرانی میں ہوئی۔وہ علامہ اقبال سے عمر میں صرف سات سال بڑے تھے۔اردو، عربی اور فارسی کی تعلیم گھر پر حاصل کی جب کہ انگریزی تعلیم دہلی کے عربک اسکول میں حاصل کی۔1891ء میں محکمہ بندوبست کے انگریزی دفتر میں ملازم ہوئے اور کچھ مدت بعد مستعفی ہو گئے۔مولانا کی سب سے پہلی تصنیف ''حیات صالحہ'' ہے۔اردو میں دردانگیز اور غمگین ناول نگاری کی وجہ سے مشہور ہیں۔عورتوں کی مظلومیت اور ظلم و ستم کے واقعات کو بیان کرنے میں کمال حاصل تھا۔ناول نگار کے علاوہ مضمون نگار۔انشا پرداز صحافی کی حیثیت سے بھی مشہور ہیں۔68 سال کی عمر میں دو ماہ بیمار رہ کر 3 فبروری 1936ء کو اس دار فانی سے کوچ کیا۔وہ کثیر التصانیف ادیب ہیں۔ان کی تصانیف کی فہرست درج ذیل ہے۔

صبح زندگی۔شامِ زندگی۔سیدہ کا لال اور فاطمہ کا لال اہمیت کے حامل ہیں۔ان کے علاوہ شبِ زندگی۔طوفان حیات۔جوہر خدمتِ۔منازل السائرہ۔نوحۂ زندگی۔امت شیطانی۔سات روحوں کے اعمال نامے۔بیلہ میں میلہ۔ستونتی۔مؤدودہ۔تفسیر عصمت۔بنت الوقت۔سرابِ مغرب۔انگوٹھی کا راز۔فسانۂ سعید۔ولائتی ننھی۔منازل ترقی۔بچہ کا کرتہ۔ویڈیا کی سرگزشت۔چہار عالم۔جوہر عصمت۔سیلابِ اشک۔طوفانِ اشک۔نانی عشو۔ نسوانی زندگی۔گلدستہ عید۔رودادِ قفس۔گرفتارِ قفس۔الزہرا۔وداعِ خاتون۔شب حزیں۔وداعِ ظفر۔امین کا دم واپسیں۔یاسمین شام۔عروس کربلا۔ محبوب خداوند۔تیغ کمال۔شہید مغرب۔درشہوار۔منظر طرابلس۔سودائے نقد۔شہنشاہ کا فیصلہ۔احکام نسواں۔محسنِ حقیقی۔دعائیں۔قرآنی قصے۔گڈری میں لعل۔چمنستان مغرب۔دلی کی آخری بہار۔مسلی ہوئی پتیاں۔داستان پارینہ۔عروسِ مشرق۔بزم رفتگان۔نالہ زار۔بےفکری کا آخری دن۔بلبل بیمار۔سیاحتِ ہند۔یادگار تمدن۔نشیب وفراز۔بساطِ حیات۔حوراورانسان۔دادالال بجھکو۔آفتابِ دمشق۔گوہر مقصود۔لڑکیوں کی انشا۔سوکن کا جلاپا۔ سنجوگ جیسی نثری تصانیف کے باعث علامہ راشد الخیری نے علامہ اقبال کے عہد کے نثر نگاروں میں افسانوی تخلیق کار ہونے کا ثبوت دیا۔

25.3.4 مرزا ہادی محمد رسوا

اردو کے مایہ ناز ادیب' خوش گو شاعر اور ایک اہم ناول نگار کی حیثیت سے مرزا محمد ہادی رسوا کی خدمات کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ان کی پیدائش 1858ء میں بمقام لکھنؤ ہوئی۔انھیں علامہ اقبال سے عمر میں 19 سال بڑے ہونے کا شرف حاصل ہے۔وہ آغا محمد تقی کے فرزند تھے۔مرزا صاحب کے اسلاف ماژندران سے دلی آئے تھے اور وہاں سے آکر لکھنو میں سکونت اختیار کی۔رسوا کو علم کا جس قدر شوق تھا۔اسی قدر علم کو قبول کرنے کا وصف بھی حاصل تھا۔عربی۔عبرانی۔یونانی۔انگریزی۔فارسی اور ہندی زبانوں پر گہرا عبور حاصل تھا اور فلسفہ کا مطالعہ بھی کافی گہرا تھا۔فن شاعری میں مرزا اوج مرحوم کے شاگرد تھے۔ناول نویسی میں شیریں بیانی ان کی خصوصیت ہے۔ان کے ناول ''امراؤ جان ادا کو ایک طوائف کی سوانح عمری کا درجہ حاصل ہے۔ اس کے علاوہ بہرام کی رہائی۔شریف زادہ خونی عاشق۔اختری بیگم۔خونی بھید۔خونی شہزادہ۔ذات شریف۔ڈرامالیلیٰ مجنوں۔خونی جوروا ور مثنوی۔امید و بیم لکھی۔اقبال کی رحلت سے صرف سات سال قبل 1931ء میں بمقام لکھنو انتقال ہوا۔عثمانیہ یونیورسٹی کے دارالترجمہ میں بھی ملازم رہے۔ان کی ناول نگاری کی وجہ سے اردو میں اس صنف کو ایک نئے موضوع سے آگاہی حاصل ہوئی۔

25.3.5 منشی فیاض علی ایڈوکیٹ

امتیاز علی کے صاحبزادے فیاض علی فیض آباد میں پیدا ہوئے۔ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کی۔دس برس کی عمر میں علی گڑھ بھیج دیا گیا۔جہاں سے انٹرنس اور ایف۔اے پاس کیا۔16 برس کی عمر میں ایف۔اے امتیاز سے پاس کرنے پر گورنمنٹ سے بی۔اے اسکالرشپ ملی۔ایل ایل بی تک تعلیم حاصل کی اور والدہ کے ہمراہ وکالت شروع کی۔انگریزی اور اردو رسالوں میں مضامین لکھے۔وکالت کے دوران ناول ''شمیم'' تحریر کیا۔1937ء میں دوسرا ناول ''انور'' لکھا۔ان دو ناولوں کی وجہ سے منشی فیاض علی شہرت رکھتے ہیں اور ان کو علامہ اقبال کے دور کے ناول نگار کا درجہ حاصل ہے۔اقبال کی رحلت کے بعد بھی فیاض علی کے سماجی ناولوں کی شہرت تھی۔

علامہ اقبال کے عہد کے دوسرے ناول نگاروں میں حکیم محمد علی طیب جن کے مشہور ناول گورا۔عبرت۔اختر وحسینہ۔نیل کا سانپ۔حسنِ سدور۔رام پیاری اور دیول دیوی ہے۔مرزا محمد سعید دہلوی ایم۔اے آئی ای ایس کے ناول ''خواب ہستی اور یاسمین ہیں۔اس کے علاوہ انھوں نے ''مذہب اور باطنی تعلیم'' کے نام سے ایک کتاب بھی لکھی ہے۔قاضی سرفراز حسین کے ناول شاہد رعنا۔خمار عیش۔سزائے عیش۔سعادت۔سراب عیش۔انجام عیش۔سعید۔ ثروت دلہن اور بہار عیش ہیں۔مولوی مظہر الدین نے شیر دل خاتون۔سندھ کی راجکماری۔ظلمات کا دیوتا۔کامنی اور گجرات کی حسینہ جیسے ناول تحریر کیے۔ بیگم مرزا احمد علی کا ناول ''ماہ درخشاں'' شائع ہوا۔خلیل الرحمٰن کا ناول عذرا۔فدا علی کا ناول۔بس کا روگ۔سجاد مرزا بیگ کا ناول 'تمنائے دید' لطافت حسین کا ترجمہ ''دختر فرعون''۔چودھری افضل حق کا ناول ''زندگی''کشن پرشاد کول کا ''شاما''امین الدین کا ناول ''فانوسِ خیال''منشی عبدالغفور کا ناول ''حق بہ حقدار'' عبدالمجید حیرت کا ترجمہ شدہ ناول ''بنی اسرائیل کا چاند'محمود خاں محمود کا تاریخی ناول ''حیدر علی''ظہور احمد وحشی کا ترجمہ شدہ ناول ''حجاج بن یوسف'' شائع ہوا ۔اس کے علاوہ بے شمار مترجمین نے جرجی زیدان۔آر بچ پول۔سر آرتھر کانن ڈائل۔وکٹر ہیوگو۔بروس کولیم۔رائیڈر ہیگر کے ناولوں کے ترجمے کر کے اردو ناول نگاری کی صنف میں اضافہ کیا۔اقبال کے عہد کا اردو داں طبقہ ان تمام ناول نگاروں کی تحریروں سے مستفید ہو رہا تھا۔

اپنی معلومات کی جانچ

1. عہد اقبال کے ناول نگاروں کے نام بتایئے۔
2. عہد اقبال کے چند اہم ناولوں کے نام لکھیے۔

25.4 عہد اقبال میں مختصر افسانہ

اقبال کے عہد میں جس طرح ناول کو فروغ حاصل ہوا۔ اسی طرح افسانہ کی صنف میں بھی ترقی ہوئی۔ اگر چہ اقبال کے عہد تک اردو میں افسانہ نگاروں کی تعداد کم تھی لیکن ایک صنف کی حیثیت سے افسانہ کی مقبولیت کا آغاز ہو چکا تھا۔ اقبال کے عہد میں ہی ترقی پسند تحریک کے نتیجے میں دوسری نثری اصناف کی طرح افسانہ کو بھی اعتبار کا درجہ حاصل ہوا لیکن ترقی پسند تحریک کے آغاز کے دو سال کے اندر ہی علامہ اقبال کی وفات ہوگئی۔ اقبال کے عہد کے اہم افسانہ نگاروں میں منشی پریم چند۔ سدرشن۔ سجاد حیدر یلدرم۔ اعظم کریوی۔ علی عباس حسینی کے نام لیے جاتے ہیں۔ جنھوں نے افسانے کی صنف میں عشق و عاشقی کے بجائے زندگی کی حقیقتوں کو شامل کر کے یہ ثابت کر دیا کہ افسانہ ایک ایسی صنف ہے جو زندگی کے ہر رویے کے اظہار کا سلیقہ رکھتا ہے اور اس میں بیانیہ کی اس قدر طاقت ہے کہ متاثر کرنے کی صلاحیت بھی رکھتا ہے۔

25.4.1 منشی پریم چند

بیسویں صدی کی ابتدا میں عصری حسیت، حقیقت پسندی اور عوامی زندگی کو ادب سے قریب کرنے والے قلم کاروں میں منشی پریم چند کا شمار ہوتا ہے۔ وہ بیک وقت اردو کے افسانہ نگار ہی نہیں بلکہ ناول نگار بھی ہیں۔ بنارس کے قریب واقع گاؤں لمہئی میں 31 جولائی 1880ء کو پریم چند کی ولادت ہوئی۔ ان کے والد منشی عجائب لال ڈاک خانے میں ملازم تھے۔ پریم چند کا اصلی نام دھنپت رائے تھا۔ انھوں نے چچا کا دیا ہوا نام نواب رائے بھی پسند کیا۔ پریم چند نے گاؤں کے ماحول میں ابتدائی زندگی گزاری۔ آٹھ برس کی عمر میں والدہ کا سایہ سر سے اٹھ گیا اور ان کے والد نے دوسری شادی کر لی۔ ملازمت کے سلسلے میں جب پریم چند کے والد کا تبادلہ گورکھپور میں ہوا تو پریم چند کو وہاں پرچھٹی جماعت میں داخلہ دیا گیا۔ بنارس سے انٹر پاس کیا اور محکمۂ تعلیمات میں ملازمت کر لی۔ 1901ء میں رسالہ ''زمانہ'' میں مضامین لکھنے شروع کیے۔ 1904ء میں ناول ''ہم خرما و ہم ثواب''، ''جلوۂ ایثار'' 1912ء میں اور ''بازار حسن'' 1918ء میں تصنیف کیا۔ 1921ء میں تحریک آزادی میں حصہ لینے کے لیے ملازمت سے استعفیٰ دے دیا۔ 1903ء میں بنارس کے ہفتہ وار ''آوازۂ خلق'' میں ایک ناول ''اسرار معابد'' سلسلہ وار لکھنا شروع کیا۔ پریم چند کا پہلا افسانہ ''دنیا کا انمول رتن'' 1907ء میں شائع ہوا۔ 1909ء میں ان کے افسانوں کا مجموعہ ''سوز وطن'' شائع ہوا جس کو حکومت نے ضبط کر لیا تو انھوں نے پریم چند کے قلمی نام سے لکھنا شروع کیا اور اسی نام سے ماہنامہ ''زمانہ'' کانپور میں ان کا افسانہ ''بڑے گھر کی بیٹی'' شائع ہوا۔ 1936ء میں ترقی پسند مصنفین کے پہلے اجلاس کی صدارت کی اور اسی سال لاہور میں ''آریا پرتھی ندھی سبھا'' میں شامل ہوئے۔ 8 اکتوبر 1936ء کو 56 سال کی عمر میں انتقال کیا۔ پریم چند کے افسانوں کے مجموعے ''سوزِ وطن''۔ ''پریم پچیسی'' حصہ اول و دوم ''پریم بتیسی''۔ ''پریم چالیسی'' حصہ اول و دوم۔ ''آخری تحفہ''۔ ''زادراہ''۔ ''دودھ کی قیمت'' اور آخری مجموعہ ''واردات'' 1938ء میں شائع ہوا۔ پریم چند کی افسانہ نگاری میں اس وقت کے سماجی، معاشرتی اور سیاسی حالات کی جھلکیاں موجود ہیں اور انھوں نے اپنے افسانہ کو زندگی سے قریب لا کر لازوال کر دیا ہے۔ ان کے ناول ''میدان عمل۔ پردۂ مجاز۔ چوگانِ مستی۔ غبن۔ نرملا۔ فردوس خیال۔ جلوۂ ایثار۔ گوشۂ عافیت اور گئودان کے توسط سے ناول کے فن پر ان کی دسترس کا اندازہ ہوتا ہے۔

25.4.2 سجاد حیدر یلدرم

سید سجاد حیدر یلدرم کے آبا و اجداد وسط ایشیا سے ہندوستان آئے تھے۔ یلدرم 1888ء میں بمقام نہٹور ضلع بجنور پیدا ہوئے۔ جب یلدرم سنِ شعور کو پہنچے تو والد نے انھیں علی گڑھ بھیج دیا۔ 1897ء میں انھوں نے ایف۔ اے کا امتحان پاس کیا اور تبھی ترکی زبان سے رغبت پیدا ہوئی۔ اس دور میں علی گڑھ کالج، الٰہ آباد یونیورسٹی سے ملحق تھا۔ چنانچہ 1901ء میں یلدرم نے بی۔ اے کیا۔ ترکی کے سفارت خانۂ عراق میں ایک ترجمان کی جگہ خالی تھی تو علی گڑھ کالج کے پرنسپل کی سفارش پر یلدرم کا تقرر ہو گیا۔ بچوں کی تعلیم کے لیے لکھنؤ منتقل ہوئے اور 13 اپریل 1942ء کو انتقال ہوا۔ علامہ اقبال سے عمر میں

11 سال کم تھے اور اقبال کی رحلت کے چار سال بعد فوت ہوئے۔ سجاد حیدر یلدرم ایک کامیاب مترجم اور ترجمہ نگاری کے اصولوں سے واقف تھے۔ انھوں نے ترکی افسانوں کے اردو ترجموں کی بنیاد رکھی۔ انھوں نے سب سے پہلے ترکی قلم کار خلیل رشدی کے افسانے کا ترجمہ ''نشے کی پہلی ترنگ'' کے نام سے کیا۔ ترکی کے مشہور مصنف نامق کمال کے ڈرامے ''جلال الدین خوارزم شاہ'' کو اردو میں منتقل کیا۔ ترکی کے ناول نگار احمد حکمت کی پہلی کہانی کا ''ثالث بالخیر'' کے زیر عنوان ترجمہ کیا۔ احمد حکمت کی کہانیوں کے مجموعے ''خارستاں وگلستاں'' کو اردو جامہ پہنایا۔ یلدرم کی تصنیف ''خیالستان'' کے چار افسانے بقول یلدرم ترکی سے ماخوذ ہیں۔ انھوں نے اپنے افسانوں اور انشائیوں سے ادب لطیف کے نقوش ابھارے ہیں۔ اس کے علاوہ ''حکایات واحساسات'' ۔ ''پرانا خواب'' ۔ ''جنگ وجدال'' اور ''زہرہ'' جیسی تصانیف سے اندازہ ہوتا ہے کہ ترکی ناول' افسانے اور ڈراموں کے ترجمے کر کے یلدرم نے اردو نثر کے دامن کو وسیع کیا۔

25.4.3 سدرشن

علامہ اقبال کے معاصر قلم کاروں میں سدرشن ایک ایسے نثر نگار ہیں جنھوں نے افسانہ نگاری کی وجہ سے نثر میں نام کمایا۔ ان کے افسانوں میں حقیقت پسندی' وطنیت کے جذبے کے علاوہ انسانی فطرت کی بھرپور عکاسی ملتی ہے۔ علامہ اقبال کی پیدائش کے سولہ سال بعد سدرشن کی پیدائش 1895ء میں پنجاب میں ہوئی۔ ان کے آباء واجداد کشمیر سے سیال کوٹ آ گئے تھے۔ سدرشن ایک برہمن خاندان سے تعلق رکھتے تھے ان کا اصلی نام پنڈت ہوری ناتھ تھا۔ پانچ سال کی عمر میں اسکول میں داخل ہوئے اور اینگلو ورنا کولر اسکول سیال کوٹ سے مڈل کی سند حاصل کی۔ مشن کالج سیال کوٹ سے ہائی اسکول اور ایف۔ اے پاس کیا اور پنجاب یونیورسٹی سے بی۔ اے کیا۔ تیرہ سال کی عمر میں افسانہ نگاری شروع کی۔ ان کا پہلا افسانہ ''سدا بہار پھول'' شائع ہوا۔ وہ آریہ سماج سے وابستہ تھے۔ 1915ء میں مثالہ شریف کے ایک معزز گھرانے میں لیلاوتی سے شادی کی۔ 1913ء میں سیالکوٹ سے لاہور آئے۔ اخبار ''دیش'' کی مجلس ادارت میں شامل ہوگئے۔ 1916ء میں ہفتہ وار اخبار ''چندر'' نکالا لیکن مالی مشکلات کی وجہ سے بند ہوگیا۔ احمد شجاع کے اخبار ''حق'' کی ادارت کی۔ 1927ء میں لاہور سے کانپور آ گئے اور لال املی اون فیکٹری میں ملازمت کر لی۔ 1930ء میں لال املی ملازمت سے علیحدہ کر دیے گئے۔ بنارس سے رسالہ ''ہنس'' اور 1981ء میں رسالہ ''کندن'' جاری کیا۔ 1932ء میں سدرشن کلکتہ پہنچے اور 1939ء میں تھیٹریکل کمپنی میں ماہانہ تنخواہ پر ڈرامے لکھنے لگے۔ انھوں نے اپنا ڈراما ''مزدور'' پیش کیا جو بے حد مقبول ہوا۔ انھوں نے فلموں میں کہانیاں لکھیں۔ ''رامائن'' ۔ ''دھوپ چھاؤں'' ۔ ''پتھروں کا سوداگر'' ۔ ''گرام فون سنگر'' ۔ ''پردیسی'' ۔ ''سکندر'' اور ''چندر ریکھا'' ان کی یادگار فلمیں ہیں۔ بمبئی میں سکونت اختیار کی اور 6 دسمبر 1967ء کو انتقال ہوا۔ اقبال کی رحلت کے زائد از 29 سال زندہ رہے

سدرشن نے ناول بھی لکھے' افسانے بھی تحریر کیے اور ڈرامے بھی پیش کیے۔ ان کے مضامین کے مجموعے بھی شائع ہو چکے ہیں۔ ان کے ناولوں میں پتھروں کا سوداگر۔ گناہ کی بیٹی۔ راج سنگھ۔ قدرت کا کھیل۔ بے گناہ مجرم اور کنج عافیت اہمیت کے حامل ہیں۔ ان کے افسانوں میں ''گل خارستان۔ رشوت کا روپیہ۔ آزمائش۔ تھوڑا سا جھوٹ شہری زندگی کے نمائندہ ہیں۔ دیہاتی زندگی پر مبنی افسانے بھی اہمیت کے حامل ہیں۔ ان کی کہانیوں کے مجموعے سولہ سنگار۔ سدا بہار پھول۔ صبح وطن۔ چندن۔ بہارستان۔ بنگال بتیسی۔ قوس قزح۔ من کی موج اور چشم وچراغ اہمیت کے حامل ہیں جب کہ ان کے ڈرامے ''محبت کا انتقال'' ۔ ''اندھے کی دنیا'' ۔ ''سنگیت'' ۔ ''مہابھارت'' ۔ ''رشی دیانند'' ۔ ''راجپوت کی شکست'' ۔ ''چھایا'' ۔ ''رستم سہراب'' ۔ ''گناہ کا پرائشچت کنڈ'' مشہور ہیں۔ ان کے مضامین ''چٹکیاں'' ۔ ''من کی موج'' ۔ ''امرت'' ہمارے رشی کے پیاری باتیں'' ۔ ''پاس'' ۔ ''پھول وتی'' اور ''پریم چالیسی'' قابل مطالعہ ہیں اور انھوں نے 1922ء میں ''تذکرہ گلدستہ سخن'' بھی مرتب کیا۔ دیہاتی اور شہری زندگی کی موثر نمائندگی کی وجہ سے سدرشن اردو ناول اور افسانہ نگاری میں انفرادی مقام رکھتے ہیں۔

25.4.4 علی عباس حسینی

علی عباس حسینی کی پیدائش 31 فروری 1898ء کو بمقام پارہ ضلع غازی آباد ہوئی۔ ان کا بچپن کھیت کھلیان اور گاؤں کے ماحول میں گزرا۔ گیارہ سال کی عمر میں مدرسہ سلیمانیہ پٹنہ میں داخل ہوئے۔ بچپن میں والد کے کتب خانے سے استفادہ کر کے کئی کتابوں کا مطالعہ کیا۔ 1915ء میں میٹرک کا امتحان پاس کیا پھر لکھنؤ کے کرسچین کالج میں تدریس کی منزلیں طے کیں۔ 1917ء میں ایف۔ اے اور اس کے بعد کیننگ کالج لکھنؤ سے بی۔ اے کامیاب

کیا۔وہ اپنے گاؤں کے پہلے گریجویٹ تھے۔الہ آباد کے ٹریننگ کالج میں 1921ء میں ایل ٹی کر کے گورنمنٹ اسکول رائے بریلی میں انگریزی اور تاریخ کے معلم مقرر ہوئے۔وہ مختلف تعلیمی اداروں میں برسر خدمت رہے۔1941ء میں حسین آباد انٹر کالج کے پرنسپل مقرر ہوئے۔ 3 جون 1954ء کو پرنسپل کے عہدے سے سبکدوش ہو گئے۔فلموں کے لیے کچھ کہانیاں لکھنے کی کوشش کی۔ممبئی کا سفر کیا لیکن اس کام سے مطمئن نہ ہو سکے اور دہلی چلے آئے۔دل کے مریض تھے صحت خراب رہنے لگی۔27 ستمبر 1969ء کی صبح کو داعی اجل کو لبیک کہا۔طالب علمی کے زمانے سے ہی مغربی فکشن کا مطالعہ کرنا شروع کر دیا تھا۔پریم چند کے انداز میں افسانہ لکھنے کی بنیاد رکھی۔پہلا افسانہ ''پژمردہ کلیاں'' 1918ء میں شائع ہوا۔علی عباس حسینی کے افسانوں کے مجموعے'' رفیق تنہائی۔باسی پھول۔گومتی۔ایک حمام میں۔ہمارے گاؤں۔آئی سی یس۔کچھ نہیں ہے۔پھولوں کی جھڑی۔گائے امان۔سیلاب کی راتیں اور ''ندیا کے کنارے'' ہیں۔انھوں نے دوسو سے زائد افسانے لکھے۔ابتدائی دور کی افسانہ نگاری پر رومانیت کا غلبہ ہے۔آغاز میں اصلاع کی دیہی زندگی کو پیش کیا۔ان کے افسانے ''آئی سی یس'' اور ''باسی پھول'' میں حقیقت پسندی نمایاں ہے وہ زندگی اور اس کی تلخ حقیقتوں کے مصور محسوس ہوتے ہیں۔علی عباس حسینی نے اپنی افسانہ نگاری کو بدلتے ہوئے میلانات سے ہم آہنگ کر کے اپنی عصری حسیت کا ثبوت دیا ہے۔''ایک حمام میں'' اور ''سیلاب کی راتیں'' میں ان کی حقیقت نگاری عریانیت کی حدوں کو چھو لیتی ہے۔اگست 1964ء میں ان کے افسانوں کا آخری مجموعہ ''ندیا کنارے'' شائع ہوا۔علی عباس حسینی کے ناول'' سید احمد پاشاہ'' یا ''قاف کی پری''۔''شائد کے بہار آئی۔''حکیم بانا'' یا ''انیٹوں کا بادشاہ 1919ء سے لے کر 1955ء تک کے عرصے میں لکھے گئے جن میں مختلف اسالیب موجود ہیں۔ان کے ڈراموں کا مجموعہ ''نورتن'' 1943ء میں شائع ہوا جو نو ڈراموں پر مشتمل ہے۔وہ ڈرامے کے فن سے خوب واقف تھے۔ان کی دیگر کتابیں ''ناول کی تاریخ وتنقید'' 1947ء میں شائع ہوئی۔''تذکرہ اردو مرثیہ'' انتقال کے بعد شائع ہوئی۔مشہور امریکی فلسفی ڈیوڈ تھورو کی کتاب ''والڈن'' کو انھوں نے اردو میں منتقل کیا۔عرض عہد اقبال کے ایک باشعور ناول' افسانہ نگار' ڈرامہ نویس' محقق اور مصنف کی حیثیت سے علی عباس حسینی کی خدمت نا قابل فراموش ہیں۔اقبال کی رحلت 31 سال بعد تک وہ حیات رہے۔

اپنی معلومات کی جانچ:

1. عہد اقبال کے افسانہ نگاروں کے نام لکھیے۔
2. اقبال کے عہد کے چند اہم افسانوں کے نام بتایے۔

21.5 عہد اقبال میں اردو ڈراما

سید آغا حسن امانت کی ''اندر سبھا'' کو ابتدائی دور میں شہرت حاصل ہو چکی تھی۔اسی کی پیروی اور اتباع میں اقبال کے ابتدا عہد تک کئی اندر سبھائیں لکھی گئیں۔اس دور میں مداری لال کی اندر سبھا کو فروغ حاصل ہوا۔کانپور کے شیخ فیض بخش نے ڈرامے کی حمایت میں ڈھاکہ کے قیام کے دوران نوابین ڈھاکہ کی سرپرستی میں اردو اسٹیج کا آغاز کیا جس میں محلہ سانچی مندر کے ارباب نشاط اور موسیقاروں نے مدد کی۔شیخ امام بخش کانپوری کا ڈراما ''ناگر سبھا'' کافی مقبول ہوا۔نواب علی نفیس کانپوری نے بھی ڈرامے کی ترقی میں مدد کی۔شیخ فیض بخش کی ذاتی کمپنی ''فرحت افزا تھیٹریکل کمپنی'' کے توسط سے اسٹیج ڈرامے کو فروغ ہوا۔اس کے ڈراما نگار نفیس کانپوری تھے اس کمپنی کے ذریعے تیس بتیس ڈرامے اسٹیج کیے گئے۔ماسٹر احمد حسن وافر کے ڈرامے ''بلبل بیمار'' کی پیش کش سے اردو ڈراما میں ایک نیا موڑ آیا۔1861ء سے بمبئی میں تھیٹریکل کمپنی کا وجود تھا۔اقبال کی پیدائش سے پانچ سال قبل 1872ء میں وکٹوریہ تھیٹر میں ''بے نظیر و بدر منیر'' اسٹیج کیا گیا۔اسی دور میں کنور جی ناظر یہ چاہتے تھے کہ طلسماتی اور حیرت ناک ڈرامے دکھائے جائیں۔انھوں نے ''الہ دین اور اس کا چراغ'' پیش کیا۔پارسیوں کی کئی تھیٹریکل کمپنیوں سے اس وقت تک مہدی حسن احسن لکھنوی' آغا حشر کاشمیری' اور بیتاب بنارسی جیسی ادبی ہستیاں وابستہ ہو چکی تھیں۔بمبئی۔دہلی۔آگرہ۔حیدر آباد۔کلکتہ۔بریلی۔لاہور اور ٹونک میں کئی تھیٹریکل کمپنیاں قائم ہو چکی تھیں جو ڈرامے کی ترقی میں حصہ لے رہی تھیں۔ممبئی کی تھیٹریکل کمپنیوں میں اور یجنل تھیٹریکل کمپنی (پسٹن جی فرام) وکٹوریہ ناٹک کمپنی (خورشید جی باٹلی والا) الفریڈ تھیٹریکل کمپنی اور اولڈ پارسی تھیٹریکل کمپنی قائم تھیں۔دی راجپوتانہ مالوہ تھیٹریکل کمپنی (جودھپور) لائٹ آف انڈیا تھیٹریکل کمپنی (آگرہ) بے نظیر اسٹار آف تھیٹریکل کمپنی (آگرہ۔علی گڑھ) انڈین امپریل تھیٹریکل کمپنی (فتح پور) دی مون آف انڈیا تھیٹریکل کمپنی (حیدر آباد) مشہور تھیں۔شکسپیرین تھیٹریکل کمپنی (ممبئی) پارسی الگزینڈر تھیٹریکل کمپنی (دہلی) سوریہ وجے ناٹک کمپنی (بریلی) گلوب تھیٹر آف پنجاب (لاہور) اور سرکاری تھیٹریکل کمپنی (ٹونک) وغیرہ کمپنیوں کا

سلسلہ 1936ء تک ختم ہوگیا۔ان کمپنیوں میں منشی کی حیثیت سے رونق بنارسی ۔ جناب رامپوری اور طالب بنارسی جیسے قلم کار وابستہ تھے۔مرزا شوق کے نواسے ''احسن'' میں نرائن پرشاد بے تاب۔ محشر انبالوی۔ آرزو لکھنوی۔نشتر اور احمد شجاع کے نام بطور ڈراما نگار قابل ذکر ہیں۔آغا حشر کے بعد میر غلام علی نے تیس ڈرامے قلم بند کیے۔محشر انبالوی اور آرزو لکھنوی نے بھی ڈراما نگاری میں شہرت حاصل کی یہ تمام ڈراما نگار اقبال کے عہد کی ڈراما نگاری کی نمائندگی کرتے ہیں۔

25.5.1 آغا حشر کاشمیری

اردو ڈراما نگاری کے شیسکپیر کی حیثیت سے مشہور آغا حشر کاشمیری کی تاریخ پیدائش یکم اپریل 1876ء بتائی جاتی ہے۔ان کے والد کا نام غنی شاہ تھا۔ان کا نام آغا محمد شاہ اور آبائی وطن کشمیر تھا۔اپنے والد سے ابتدائی اردو، عربی اور فارسی زبانیں سیکھیں۔باقاعدہ تعلیم حاصل کرنے کے لیے بنارس کے ''راج نرائن ہائی اسکول'' میں داخلہ لیا۔سترہ اٹھارہ سال کی عمر میں شاعری شروع کی۔1897ء میں جب بمبئی کی الفریڈ تھیٹریکل کمپنی بنارس آئی۔آغا حشر نے مہدی حسن احسن کا لکھا ہوا۔ڈراما ''چندراولی'' دیکھا اور اسی انداز میں ایک ڈراما ''آفتاب محبت'' لکھا۔جسے رد کردیا گیا۔اپنے والد کے ہمراہ بمبئی آنے کے بعد آغا حشر نے ''مرید شک'' ڈراما 1899ء میں لکھا۔جو اسٹیج کے جانے کے بعد بہت مقبول ہوا۔1901ء میں انھوں نے ڈراما ''اسیر حرص'' مکمل کیا۔1910ء میں وہ حیدر آباد پہنچے اور اپنی ذاتی ڈراما کمپنی قائم کی۔اسی دوران ''سلور کنگ عرف نیک پروین'' تحریر کیا اور یہ ڈراما ''جرم وفا'' کے نام سے اسٹیج کیا گیا۔انھوں نے بہت جلد ڈراما کمپنی بند کردی اور سہراب جی کی فرمائش پر تازہ ڈراما ''خود پرست'' لکھا جو ''باپ کا قاتل'' کے نام سے اسٹیج کیا گیا۔اصلاحی ڈراما ''نعرۂ توحید عرف شیر کی گرج'' تحریر کیا۔مدھر مرلی، بھاگیرت گنگا، تر کی حور اور آنکھ کا نشہ تحریر کیا۔1924ء میں بنارس آئے اور ''سیتا بن باس'' ڈراما پیش کیا۔1935ء کو مختصر سی علالت کے بعد انتقال کیا۔ان کے ڈراموں میں ''خوبصورت بلا'' اور ''یہودی کی لڑکی'' نا قابل فراموش ہیں۔

25.5.2 حکیم احمد شجاع

حکیم احمد شجاع کی تاریخ پیدائش 1893ء بتائی گئی ہے۔ابتدائی تعلیم اپنے وطن لاہور میں حاصل کی۔اعلیٰ تعلیم کے لیے علی گڑھ کا رخ کیا۔تعلیم سے فارغ ہوکر وطن واپس ہوئے۔وہ آغا حشر کے مداحوں اور قدر دانوں میں سے تھے۔کالج کے زمانے میں چند ڈرامے لکھے۔باقاعدہ ڈراما نگاری کا آغاز 1918ء میں کیا۔ان کے ڈرامے ''حسن کی قیمت''۔''باپ کا گناہ''۔''بھیشم پرتگیا''۔''آخری فرعون''۔''جانباز'' اور ''بھارت کا لال'' اور ''دلہن'' وغیرہ ہیں۔گورنمنٹ کالج لاہور کی جانب سے ان کے ڈرامے ''مینا''۔''سنتوش'' اور ''تارا'' ترجمہ کرکے اسٹیج کیے گئے۔ان کا پہلا ڈراما میلو ڈرامے کے انداز پر ہے جو آغا حشر کے تعاون سے اسٹیج بھی کیا گیا اور اس کی اشاعت بھی عمل میں آئی۔ان کے ڈراموں میں اس عہد کی تہذیبی جھلک موجود ہے جب 1921ء میں میڈن تھیٹر کے پارسی سیٹھ نے آغا حشر سے ڈرامے لکھنے کی خواہش کی تو انھوں نے اپنے شاگرد حکیم احمد شجاع کی سفارش کی۔چنانچہ انھوں نے کئی تھیٹریکل کمپنیوں کے لیے ڈرامے لکھے اور مقبولیت حاصل کی۔

25.5.3 سید مہدی حسن احسن

میر حسن جو اودھ کی شاہی فوج میں ملازم تھے۔ان کے صاحبزادے سید مہدی حسن احسن کو شعر گوئی میں شہرت حاصل ہوئی اور وہ احسن لکھنوی کے نام سے مشہور ہوئے۔نواب مرزا شوق کے بھائی حکیم نواب میر آغا حسن ازل نہ صرف مہدی حسن کے نانا تھے بلکہ ان کی تربیت میں معاون ہوئے۔ان کے مکان کے قریب ''افضل محل'' تھا جہاں پارسی کمپنیاں ڈرامے اسٹیج کیا کرتی تھیں۔وہ وہاں جاتے اور ڈرامے دیکھنے کی وجہ سے کم سنی سے ہی ڈرامے کا شوق ہوگیا۔1897ء میں الفریڈ کمپنی کے مستقل ڈراما نگار بن گئے۔ان کا پہلا اسٹیج کیا جانے والا ڈراما ''چندراولی'' تھا۔انھوں نے انگریزی ڈراموں کی لطافت اور جاذبیت کو اردو والوں سے روشناس کروانے کے لیے شیسکپیر کے ڈراموں کا اردو میں ترجمہ کیا۔احسن لکھنوی نے '' ہیملٹ'' کا ترجمہ ''خون ناحق''۔''رومیو جولیٹ'' کا ترجمہ ''گلنار فیروز'' اور ''کومیڈی آف ایرز'' کا ترجمہ ''بھول بھلیاں'' کے نام سے کیا۔''میکبتھ'' کا ترجمہ بھی کیا۔ان کی سادہ اور عام فہم زبان نے ڈراموں کو بڑی مقبولیت بخشی۔ان کے طبیعزاد ڈرامے بھی قدر کی نگاہ سے دیکھے گئے۔''چندراولی''۔''چلتا پرزہ''۔''کنک تارا''۔''شریف بدمعاش''۔''گن سندری'' اور ''سیتا ہرن'' سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھیں ڈراما نگاری میں خاص مہارت حاصل تھی۔انھوں نے شوق کی مثنوی ''زہر عشق'' سے ماخوذ ڈراما ''دستاویز محبت'' تحریر کیا۔احسن کے ڈرامے ابتدائی دور کی ڈراما نگاری کی بہت سی کوتاہیوں سے پاک ہیں۔فنی اور ادبی اعتبار سے ان کے ڈرامے اپنے دور کے ترقی یافتہ ڈراموں کی نمائندگی کرتے ہیں۔

25.5.4 نرائن پرشاد بیتاب

بلند شہر کے ایک موضع میں پیدا ہونے والے نرائن پرشاد بیتاب کے والد کا نام مہاراج ڈھالا رے تھا۔ انھوں نے حکیم سردار محمد خاں طالب سے اردو فارسی پڑھی اور پنڈت ستیش چندروید سے ہندی سیکھی۔ وہ سنسکرت بھی جانتے تھے۔ وہ اپنی مٹھائی کی دکان پر کام بھی کرتے اور تعلیم بھی حاصل کرتے تھے۔ کم عمری ہی سے بیتاب کو شعر گوئی کا شوق تھا۔ دہلی میں اپنے رشتہ دار پربھو دیال کے پاس پہنچے تو اپنی زبان کو نکھارنے کا موقع ملا۔ منشی نظیر حسین سخا سے شرف تلمذ حاصل کیا۔ بیتاب کو اپنے استاد کے ساتھ تھیٹریکل کمپنیوں میں جانے کا موقع ملا۔ جس کی وجہ سے ڈرامے سے دلچسپی پیدا ہوئی۔ انھوں نے الفریڈ کمپنی کے لیے 1901ء میں ڈراما ''قتل نظیر'' اور 1902ء میں ''حسن فرنگ'' لکھا جسے پسند کیا گیا۔ یہ ڈرامے اسٹیج بھی ہوئے۔ احسن لکھنوی کے بعد وہ الفریڈ کمپنی میں ڈراما نگار کی حیثیت سے کام کرنے لگے۔ اسٹیج کے زوال کے بعد بولتی فلمیں متعارف ہوئیں۔ انھوں نے فلم سے وابستگی اختیار کی۔ انھوں نے بمبئی سے ''شیکسپیئر'' کے نام سے ماہنامہ جاری کیا۔ ان کے مشہور ڈرامے۔ قتل نظیر۔ زہریلا سانپ۔ میٹھا زہر۔ امرت اور گورکھ دھندا ہیں۔ ہندی ڈراموں میں کرشن اوتار۔ رامائن۔ پتنی پرتاب۔ کرشن سداما۔ گنیش جنم۔ شکنتلا۔ مدرا نڈیا اور مہابھارت ہیں۔ وہ ڈراما نگاری میں خود کو آغا حشر کاشمیری سے کم نہیں سمجھتے تھے۔ بمبئی میں ہی انتقال کیا۔ وہ اقبال کے عہد کے ڈراما نگاروں میں شمار کیے جاتے ہیں۔ ان کی تاریخ پیدائش اور وفات کا علم نہیں لیکن ان کے ڈراموں کی تاریخ سے نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ ان کا تعلق اقبال کے عہد سے تھا اور انھوں نے شعر گوئی کے علاوہ ڈراما نگاری کی طرف خصوصی توجہ دی۔

25.5.5 امتیاز علی تاج

اردو ڈراما نگاری کی تاریخ میں امتیاز علی تاج کو بلند مقام حاصل ہے۔ وہ 13، اکتوبر 1900ء کو لاہور کے ایک ذی علم گھرانے میں پیدا ہوئے۔ اس اعتبار سے وہ اقبال سے 23 سال چھوٹے تھے۔ انھوں نے گورنمنٹ کالج لاہور سے 1922ء میں بی۔ اے کی ڈگری حاصل کی۔ تاج کے والد نے ''تہذیب نسواں'' رسالہ جاری کیا تھا۔ والد کے انتقال کے بعد تاج نے ''تہذیب نسواں'' کی ذمہ داری قبول کی۔ 1918ء میں ''کہکشاں'' رسالہ جاری کیا جس میں پریم چند کے افسانے شائع ہوئے۔ 1922ء میں ہی تاج کا مشہور ڈراما ''انارکلی'' عالم وجود میں آیا۔ اسے پہلی بار لاہور سے 1932ء میں شائع کیا گیا۔ امتیاز علی تاج نے نشریات میں کمال حاصل کیا چنانچہ ان کے نشری ڈرامے ''قرطبہ کا قاضی''۔ ''گونگی جورو''۔ ''ورجینا''۔ ''خوشی''۔ ''حریم قلب''۔ ''صرف کانوں کے لیے''۔ ''شیخ برادران''۔ ''اصفہان کے متشاعر''۔ ''الو کی زبان''۔ ''صید و صیاد''۔ ''امن و سکون''۔ ''کمرہ نمبر 5'' اور ''ان کے ابا'' ریڈیو سے نشر ہوئے۔ وہ 1958ء میں ''مجلس ترقی ادب'' کے ڈائرکٹر مقرر ہوئے۔ ''بزم اقبال'' کے معتمد اعزازی بھی رہے۔ انھیں حکومت پاکستان کا اہم اعزاز ''ستارۂ امتیاز'' عطا کیا گیا۔ امتیاز علی تاج نے ''شاہ جہاں'' اور ''روشن آراء'' ڈرامے بھی تحریر کیے لیکن ''انارکلی'' ڈرامے کی وجہ سے انھیں شہرت حاصل ہوئی۔ انھوں نے شعر گوئی بھی کی۔ وہ کثیر التصانیف نثر نگار ہیں۔ ''اسکول کی کہانیاں۔ ابوالحسن۔ بونوں کی دنیا۔ بیربل کی کہانیاں۔ خزانوں کی کہانیاں۔ خانہ بدوشوں کی کہانیاں۔ سانپوں کی کہانیاں۔ جنوں کی کہانیاں۔ طلسمات کی کہانیاں۔ کنجوسوں کی کہانیاں۔ سمندری شہزادہ۔ بچوں کی بہادری۔ پرستان۔ پھول باغ۔ پھولوں کی کلیاں۔ چڑیا خانہ۔ جامعہ کا برج۔ جھوٹ موٹ کا بھوت۔ کمک اردو۔ موت کا راگ۔ ہیبت ناک افسانے اور چچا چھکن ان کی نثری یادگاریں ہیں۔ وہ کلاسیکی ڈراموں کو مرتب کر کے منظر عام پر بھی لائے۔ طالب علمی کے زمانے سے امتیاز علی تاج کو تھیٹر سے دلچسپی تھی چنانچہ انھوں نے زبانی روایت پر مبنی ایک قصے کو ''انارکلی'' میں پیش کیا۔ 1922ء میں ان پر رومانویت کا غلبہ تھا۔ وہ ایک ڈراما نگار کی حیثیت سے مشہور ہوئے۔ کسی نے انھیں 9 اپریل 1970ء کی رات کو حملہ کر کے قتل کر دیا جب کہ وہ محو خواب تھے۔ اردو ڈراما نگاری کے امتیاز علی تاج بے تاج بادشاہ ہیں۔ مختلف تھیٹریکل کمپنیوں نے ''انارکلی'' کو اسٹیج کرنے کے لیے مختلف تبدیلیوں کی خواہش کی تھی لیکن امتیاز علی تاج نے مناسب نہیں سمجھا۔ اسٹیج کی صلاحیتیں نہ رکھنے کے باوجود بھی ''انارکلی'' اردو ڈرامے کی تاریخ میں اہمیت کا حامل ہے اور عہد اقبال کے نثر نگاروں میں امتیاز علی تاج کو ایک ڈراما نگار کی حیثیت سے اہمیت حاصل ہے۔

اپنی معلومات کی جانچ:

1. اقبال کے دور کے چند اہم ڈراما نگاروں کے نام بتائیے۔
2. اقبال کے عہد کے چند اہم ڈرامے کون سے ہیں؟

25.6 عہد اقبال میں غیر افسانوی نثر

اقبال نے جس دور میں زندگی گزاری۔ اس عہد میں اردو نثر کا ارتقا عمل میں آ چکا تھا۔ قصہ کہانی کی نثر کو افسانوی نثر کی حیثیت کا درجہ حاصل تھا اور دنیا کی حقیقتوں کو بیان کرنے والی نثر کو غیر افسانوی نثر کی حیثیت سے مقبولیت حاصل ہو چکی تھی اور بے شمار قلم کار سوانح نگاری، مضمون نویسی، انشائیہ نگاری، خطوط نویسی، خودنوشت، سفرنامے، صحافت، تحقیق و تنقید اور طنز و مزاح کے ذریعے اپنے فن کے جوہر دکھا رہے تھے۔ صحافت کے توسط سے اداریہ نویسی، کالم نگاری، تبصرہ نگاری اور ایسے ہی بے شمار غیر افسانوی اصناف کا عروج ہو چکا تھا۔ تاریخ، فلسفہ، منطق، اخلاق اور مذہبیات کے علاوہ جدید علوم و فنون پر کتابوں کی تحریر کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا۔ جہاں غیر افسانوی اصناف کو عروج حاصل ہو چکا تھا وہیں دارالمصنفین، اعظم گڑھ، یوپی۔ دارالترجمہ جامعہ عثمانیہ حیدرآباد اور فروغ اردو ادب کے ادارہ سے ہر عصری علوم پر کتابیں شائع ہونے لگی تھیں۔ اقبال کے عہد میں ہی حیدرآباد میں انجمن ترقی اردو نے اردو کی نادر و نایاب کتابوں کی اشاعت پر توجہ دی جس کی وجہ سے علم و ادب ہی نہیں بلکہ تحقیق و تنقید کے علاوہ صحافتی ادب میں بھی انقلاب رونما ہوا۔ اقبال کے عہد میں جن نثر نگاروں نے غیر افسانوی نثر کی نمائندگی کر کے اس دور کے ادب میں بیش بہا اضافے کیے۔ ان کے کارناموں کا جائزہ پیش ہے۔

25.6.1 مولانا ابوالکلام آزاد

اردو کے مکتوب نگار۔ انشائیہ نگار۔ کالم نگار۔ صحافی اور تبصرہ نگار کی حیثیت سے مولانا ابوالکلام آزاد کا مرتبہ کافی بلند ہے۔ انھوں نے ادب، مذہب، صحافت اور تعلیم کے میدان میں اپنے خیالات پیش کر کے شہرت حاصل کی۔ وہ شعلہ بیان مقرر۔ انشا پرداز اور کثیر التصانیف ادیب تھے جنھوں نے ہندوستان کی جدوجہد آزادی میں حصہ لیتے ہوئے جیل کی صعوبتیں بھی جھیلیں۔ ان کی کانگریس سے وابستگی اٹوٹ رہی۔ ایک ادیب کی حیثیت سے وہ غیر افسانوی نثر کے نمائندہ ہیں۔ ایک مفسر قرآن ہونے کے علاوہ مکتوب نگار۔ مضمون نگار اور صحافی کی حیثیت سے انھوں نے اپنے قلم کے جوہر دکھائے۔ مولانا آزاد کے والد مولوی خیر الدین ممتاز عالم دین تھے اور ان کے مریدین کی کثیر تعداد تھی۔ 1858ء میں علمائے دہلی کی زبوں حالی دیکھ کر مولوی خیر الدین نے مکہ معظمہ کا رخ کیا جہاں شیخ محمد طاہر وطری کی بھانجی سے خیر الدین کا عقد ہوا اور 1888ء میں مولانا آزاد کی ولادت ہوئی۔ ان کا اصلی نام احمد تاریخی نام فیروز بخت لقب ابوالکلام اور تخلص آزاد تھا۔ ان کے والد پنڈلی کی ہڈی کے علاج کے سلسلہ میں کلکتہ آئے اور وہیں بس گئے۔ یہیں پر مولانا آزاد کی ابتدائی تربیت ہوئی۔ عربی، فارسی اور منطق کا درس حاصل کیا۔ 1905ء میں تعلیمی مشاغل سے فارغ ہو کر موتی پت کے پیشہ ور گویے سے موسیقی سیکھی۔ مولانا نے موسیقی پر کتاب ''معارف نغمات'' لکھی۔ محمد یوسف جعفری سے انگریزی سیکھی 1908ء میں عراق۔ مصر اور شام کا دورہ کیا۔ عربی ان کی مادری زبان تھی۔ اسی سنہ میں فرانس کا دورہ کیا تو فرانسیسی سیکھی۔ 13 جولائی 1912ء کو ''الہلال'' جاری کیا۔ جس کی مسدودی پر 12 نومبر 1915ء کو ''البلاغ'' جاری کیا۔ 30 مارچ 1916ء کو انہیں رانچی میں نظر بند کیا گیا۔ 1920ء میں رہا ہوئے۔ مولانا ابوالکلام آزاد کی علمیت اور ذہانت کی دلیل ان کے رسالے الہلال اور البلاغ سے ہی نہیں ملتی بلکہ ان کی کتابیں تذکرہ۔ ترجمان القرآن۔ غبارِ خاطر اور کاروان خیال بھی اس کی دلیل ہیں۔ مولانا آزاد نے مضمون نگاری اور اداریہ نویسی کے ذریعہ سیاست، ادب، مذہب، اخلاق اور تہذیب کے امکانات کو روشن کر دیا۔ غرض ایک عالم دین اور مبلغ اسلام کے علاوہ مکتوب نگار۔ انشائیہ نگار۔ صحافی۔ مضمون نگار۔ مفسر۔ کالم نگار۔ تبصرہ نگار اور اداریہ نویس کی حیثیت سے مولانا ابوالکلام آزاد نے اردو دنیا میں شہرت حاصل کی اور علامہ اقبال کے عہد میں انھیں اردو کے ایک اہم غیر افسانوی نثر نگار کا درجہ حاصل تھا۔ مولانا آزاد کا انتقال 22 فروری 1958ء کو دہلی میں ہوا۔ ان کی نثر نگاری نے ادب اور صحافت کو بے حد متاثر کیا۔ مولانا آزاد کو اسلامی فکر اور جمہوریت کے ایک اہم علمبردار کا درجہ حاصل ہے۔

25.6.2 نیاز فتح پوری

علم و ادب کی دنیا میں پانچ دہائیوں سے زیادہ عرصہ تک خدمت انجام دینے والے ادیب، شاعر، نقاد، انشا پرداز، صحافی اور روشن خیال فرد کی حیثیت سے نیاز فتح پوری اہم مقام رکھتے ہیں۔ ان کی رومانوی افسانہ نگاری اور کالم نگاری اہمیت کی حامل ہے۔ ان کا اصلی نام نیاز محمد خاں اور تاریخی نام لیاقت علی خاں تھا۔ فتح پور (یوپی) میں 1887ء کو پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم مدرسہ اسلامیہ فتح پور میں ہوئی۔ اس کے بعد رام پور اور ندوۃ العلما میں تعلیم کی تکمیل کی۔ ان کے اساتذہ میں نور محمد۔ سید ظہور الاسلام۔ فاروق چڑیا کوٹی۔ اور وزیر محمد خاں رامپوری مشہور ہیں۔ فارسی اور عربی تعلیم کی تکمیل کے بعد ایف۔ اے تک انگریزی پڑھی۔ پولیس میں سب انسپکٹر کے لیے نامزد ہوئے۔ 1910ء میں تھانہ ہنڈیا ضلع الہ آباد میں تقرر عمل میں آیا۔ سب انسپکٹر کے عہدے سے

سبکدوش ہونے کے بعد ہیڈ ماسٹر مقرر ہوئے۔ مدرسہ اسلامیہ فتح پور سے وابستگی کے بعد 1910ء میں ظفر علی خاں کے جریدہ ''زمیندار'' سے وابستہ ہوئے۔ 1915ء میں بھوپال پہنچے اور گیارہ سالہ قیام کے دوران مشہور کتابیں گہوارۂ تمدن۔ صحابیات۔ مصطفیٰ کمال پاشا۔ تاریخ الدولتیں۔ تاریخ اسلام (ابتداء سے حملۂ تیمور تک) پیش کیں۔ 1927ء میں لکھنؤ منتقل ہوئے۔ 1922ء میں ''یاران بخد'' کے تعاون سے رسالہ ''نگار'' جاری کیا۔ نگار کے خصوصی نمبر آج بھی اہمیت کے حامل ہیں۔ شہاب کی سرگزشت۔ جمالستان اور نگارستان کے توسط سے انھوں نے جمالیاتی اور رومانوی افسانہ نگاری کی بنیاد رکھی۔ وہ مہاراجہ کشن پرشاد کی مثنوی کو فلمانا چاہتے تھے۔ ''حسن کی عیاریاں'' میں 24 افسانے اور ''مختارات نیاز'' میں دس افسانے ہیں جو انگریزی سے ترجمہ کیے گئے ہیں۔ ان کی نثر پر رومانیت اور پر لطف ادب لطیف کا عکس نمایاں ہے۔ وہ ایک تاثراتی نقاد بھی ہیں ''انتقادیات'' اور ''مالہ وماعلیہ'' سے ان کے تنقیدی رویے کا پتہ چلتا ہے۔ نگار کے ایڈیٹر کی حیثیت سے نیاز نے 44 سال کام کیا۔ نئے سال کا پہلا شمارہ خاص نمبر ہوتا تھا۔ ان کے خاص نمبر نظیر نمبر۔ ریاض خیر آبادی نمبر۔ مومن نمبر۔ حسرت نمبر۔ خدا نمبر وغیرہ اہمیت کے حامل ہیں۔ نیاز بعد میں پاکستان منتقل ہوئے۔ جنوری 1965ء میں کینسر کا عارضہ لاحق ہوا اور 27 مئی 1966ء کو صبح چار بجے نیاز نے اس دار فانی سے کوچ کیا۔ اردو نثر نگاری میں انھوں نے افسانے کی صنف پر توجہ دی اس کے علاوہ غیر افسانوی نثر میں مضمون نگاری۔ انشائیہ نگاری۔ تاریخ۔ تنقید۔ تحقیق اور صحافت پر خصوصی توجہ دی۔ رسالہ نگار کے خاص کالم شہرت کے حامل تھے۔ ترجمہ کی روایت کو فروغ دینے میں بھی نیاز کی خدمات نظر انداز نہیں کی جاسکتیں۔ انھوں نے افسانوں کے علاوہ اہم مضامین کے ترجموں پر بھی توجہ دی۔ اقبال کے عہد کے ہمہ جہت نثر نگاروں میں نیاز فتح پوری کا مقام کافی بلند ہے۔ وہ اقبال سے عمر میں دس سال چھوٹے تھے اور اقبال کی رحلت کے 38 سال بعد تک حیات رہے۔ انھوں نے ''نگار'' کا اقبال نمبر شائع کر کے شاعر مشرق کے عہد اور کارناموں سے اپنی وابستگی کا ثبوت پیش کیا ہے۔

25.6.3 مہدی افادی

اردو کو رومانی تحریک سے وابستہ کرنے اور نثر کو رنگینی لطافت اور تابناکی سے روشناس کرنے والوں میں مہدی افادی کا شمار ہوتا ہے۔ وہ انشا پرداز اور منفرد طرز کے نمائندہ ادیب تھے۔ گورکھپور کے محلہ بسنت پور کے ایک معزز گھرانے میں مہدی افادی نے 1870ء میں آنکھ کھولی۔ ان کے والد حاجی حسن علی کا شمار اس زمانے کے تعلیم یافتہ افراد میں ہوتا تھا۔ گھر پر ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ عربی فارسی اور اردو زبانیں سیکھیں اور ایسے مدرسہ میں داخل کیے گئے جہاں السنہ مشرقیہ کے علاوہ انگریزی کی باقاعدہ تعلیم دی جاتی تھی۔ پہلی شادی 1890ء میں ہوئی۔ اہلیہ کے داغ مفارقت دے جانے کے بعد دوسری شادی کی اور تیسری شادی عزیز النسا سے 1909ء میں ہوئی۔ وہ نائب تحصیل دار کے عہدے پر فائز تھے اور ترقی کرتے کرتے تحصیل دار ہو گئے۔ بنارس اور الہ آباد میں ملازمت کا سلسلہ قائم رہا۔ ان کا پہلا مضمون ''حکمائے یونان پر ایک سرسری نظر'' 1897ء میں شائع ہوا۔ انھوں نے رسالہ ''تہذیب الاخلاق'' کے مطالعہ سے خود کو سنوارا۔ وہ فائدہ بخش تصورات کے قائل تھے۔ چنانچہ ''افادات مہدی'' میں یہی خیالات دکھائی دیتے ہیں۔ انھوں نے بیشتر رسائل کو خطوط لکھے اور ان کی حیثیت مراسلے کی ہوگئی۔ مہدی افادی اردو نثر میں مضمون نگار۔ مراسلہ نویس اور خاص طور پر جمالیاتی نقاد کی حیثیت سے مشہور ہیں چنانچہ ان کی تحریریں غیر افسانوی نثر کی نمائندگی کرتی ہیں۔

25.6.4 ظفر علی خان

بیک وقت ادیب، خطیب، صحافی، شاعر اور سیاست داں کی حیثیت سے مشہور ظفر علی خاں کی ولادت 1870ء میں ضلع سیالکوٹ کے ایک گاؤں کوٹ میرٹھ میں ہوئی۔ وزیر آباد مشن اسکول سے مڈل پاس کیا اور پٹیالہ کے ہائی اسکول سے میٹرک کی سند حاصل کی۔ 1892ء میں علی گڑھ کالج میں شریک ہوئے اور یہاں سے ایف۔ اے کیا۔ ان کے والد کشمیر میں ڈاک وتار کے محکمے میں ملازم تھے۔ تعلیم ختم کر کے وہ کشمیر گئے اور ملازمت اختیار کر لی۔ ملازمت سے استعفیٰ دے کر علی گڑھ سے بی۔ اے کیا۔ اس وقت نواب محسن الملک کو پرائیوٹ سکریٹری کی ضرورت تھی۔ ظفر علی خان کی درخواست منظور ہوئی اور ان کی سفارش سے حیدر آباد آئے اور حیدر آباد میں اسسٹنٹ ہوم سکریٹری کے عہدے تک پہنچے۔ حیدر آباد میں ظفر علی خان نے لارڈ کرزن کی کتاب ''خیابانِ فارسی'' کا اردو ترجمہ کیا۔ وہ اپنے زمانے میں چوٹی کے ادیبوں میں شمار کیے جانے لگے۔ ان کی قومی نظموں کے مجموعے ''بہارستان۔ نگارستان اور چمنستان کافی مقبول ہوئے۔ روح معانی اور جنسیات ان کی ادبی کاوشیں ہیں۔ ظفر علی خاں کا نام رسالہ ''زمیندار'' کی وجہ سے مشہور ہے۔ ان کی نثری تصانیف میں حقائق ومعارف۔ جواہر الادب۔ حقیقت وافسانہ ان کی یادگار ہیں۔ ان کے بیشتر مضامین اسلامی تاریخ وثقافت کے اطراف گھومتے ہیں۔ انھوں نے مغربی انشا پردازی سے سادگی وپرکاری، وضاحت اور روانی کو اپنی تحریروں میں شامل کیا۔ دورِ اقبال کے غیر افسانوی نثر نگاروں میں ایک صحافی، کالم نگار اور مضمون نگار کی حیثیت سے ظفر علی خاں کا مقام کافی بلند ہے۔

25.6.5 عبدالماجد دریابادی

اردو کے سوانح نگار۔ انشائیہ نویس۔ نقاد۔ صحافی۔ عالم دین اور مذہبی مضامین کے ذریعے اردو دنیا میں شہرت حاصل کرنے والے ادیبوں میں عبدالماجد دریابادی کا شمار ہوتا ہے۔ انھوں نے مذہبی صحافت کو پروان چڑھا کر ''صدق جدید'' کے توسط سے وسیع النظری اور مذہب کی صحیح فکر کو عام کیا۔ اقبال کے عہد کے غیر افسانوی نثر نگاروں میں مولانا عبدالماجد دریابادی امتیازی مقام رکھتے ہیں۔ وہ مصلح، مفکر اور دانشور تھے۔ صحافت، سوانح، تنقید، شاعری، ڈراما نگاری اور تفسیر کے میدان میں انھوں نے نام کمایا۔ عبدالماجد دریابادی کی پیدائش 16 مارچ 1892 کو بمقام دریاباد ہوئی۔ ان کے والد ''اودھ پنچ'' کے لیے مضامین لکھا کرتے تھے۔ ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کی۔ عربی اور فارسی کی کتابیں پڑھیں۔ سیتاپور گورنمنٹ ہائی اسکول سے 1908ء میں میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ اعلیٰ تعلیم کے کیننگ کالج لکھنؤ میں داخلہ لیا۔ انٹرمیڈیٹ میں انگریزی، فلسفہ، تاریخ اور نفسیات کا نصابی مضامین کی حیثیت سے مطالعہ کیا۔ تحصیل علم کے سلسلے میں علی گڑھ۔ الہ آباد اور دہلی کا رخ کیا۔ 1912ء میں والد کے انتقال کے بعد تعلیم ترک کردی۔ گھریلو ذمہ داریاں سنبھالیں۔ مولوی عبدالحق نے انگریزی کتابوں کے ترجموں کا کام سپرد کیا۔ شبلی نعمانی نے سیرت النبی ﷺ کے انگریزی ماخذات کی تحقیق کے لیے پچاس روپے ماہور مقرر کیا۔ 1916ء میں لکھنؤ میں شادی کی۔ مولوی اشرف علی تھانوی کو عبدالماجد دریابادی کے مرشد کا درجہ حاصل ہے۔ 1919ء میں ''معارف'' سے ادارتی ربط پیدا کیا اور 1923ء تک یہ خدمت انجام دی۔ 1928ء میں ''ہمدرد'' کی نگرانی ان کے سپرد ہوئی۔ ابتدا میں ''حقیقت'' اور ''سچ'' نام کے رسائل جاری کیے۔ کچھ عرصہ کے بعد ''صدق'' جاری کیا۔ یکم ستمبر 1917ء سے جولائی 1918ء تک وہ حیدرآباد میں سکونت پذیر رہے۔ دارالترجمہ جامعہ عثمانیہ حیدرآباد سے وابستہ ہوکر منطق پر کتابوں کے ترجمے کیے۔ حکومتِ حیدرآباد سے پولیس ایکشن 1948ء تک پنشن جاری رہی۔ دسمبر 1950ء سے ''صدق جدید'' جاری کیا جو ان کے وصال تک جاری رہا۔ 1967ء کے بعد حکومت ہند نے علمی و ادبی خدمات کے پیش نظر تین ہزار روپے پنشن مقرر کی جو مرتے دم تک جاری رہی۔ 1976ء میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے ڈاکٹر آف فلاسفی کی اعزازی ڈگری عطا کی۔ دسمبر 1976ء میں فالج کے حملے سے متاثر ہوئے اور 5 جنوری 1977ء کو انتقال کیا۔ عبدالماجد دریابادی کثیر التصانیف ادیب ہیں۔ ابتدا میں انھوں نے ''غذائے انسانی''، ''محمود غزنوی''، ''فلسفہ جذبات''، ''فلسفہ اجتماع''، ''سائیکالوجی آف لیڈرشپ'' (انگریزی) ''مکالمات برکلے''، ''فلسفیانہ مضامین''، ''مبادیِ فلسفہ'' (حصہ اول و دوم) ''فلسفہ اور اس کی تعلیم''، ''ہم آپ'' اور ''منطق'' ہیں۔ 1913ء میں انھوں نے ''فلسفہ جذبات'' لکھی۔ ترجمے کے فن پر انھیں عبور تھا۔ ''تاریخ اخلاقِ یورپ'' حصہ اول و دوم ''تاریخ یورپ'' اور ''پیام امن'' اس سلسلے میں قابل ذکر ہیں۔ تصوف کے موضوع پر ان کی کتاب ''تصوف اسلام'' اتنی مقبول ہوئی کہ اس کے پانچ ایڈیشن شائع ہوئے۔ مختلف نسخوں سے ملفوظات مولانا روم ''فیہ مافیہ'' شائع کیا۔ ان کے سفرنامے ''سفرنامہ حجاز'' اور ڈھائی ہفتے پاکستان میں ''سیاحتی تاثرات'' کے آئینہ دار ہیں۔ ''زود و پشیماں'' بھی ان کی یادگار ہے۔ مصحفی کی مثنوی ''بحرالمحبت'' کو عالمانہ انداز سے شائع کرکے تحقیق کا حق ادا کیا۔ ''مقالاتِ ماجد''۔ ''انشائے ماجد'' حصہ اول و دوم اور ''نشریات ماجد'' شائع ہوچکے ہیں رسالہ ''سچ'' اور ''صدق'' میں جو مضامین شائع ہوئے تھے انھیں ''مضامین ماجد'' کے نام سے شائع کیا گیا۔ انھوں نے مشاہیر کے خطوط بھی مرتب کیے۔ ''خطوط مشاہیر'' حصہ اول اور ''مکتوبات سلیمانی'' حصہ دوم شائع ہوچکے ہیں۔ اس کے علاوہ ''تفسیر ماجدی'' بھی شائع ہوئی۔ اسلامیہ کالج پشاور کے خطبات کو ''قصص الانبیا'' اور رضا اکیڈمی رامپور کے خطبات کو ''قصص و مسائل'' کے نام سے شائع کیا گیا۔ مولانا کی کتاب ''معاصرین''۔ ان کی ہم عصر شخصیتوں کے خاکوں پر مبنی کتاب ہے۔ سوانح نگاری کی نمائندگی کرنے والی ان کی کتابوں میں حکیم الامت۔ اکبرنامہ۔ محمد علی کی ڈائری کے چند ورق اور سیرت نبوی اہمیت کی حامل ہیں۔ ان کی صحافت غیر جانبدار رہی۔ اس کے علاوہ ان کی دیگر کتابوں میں مردوں کی مسیحائی۔ سچی باتیں۔ صابر رسول۔ یتیم کی جنت۔ یتیم کا راج۔ تمدن اسلام کا پیام۔ بیسویں صدی کے نام۔ تمدن اسلام کی کہانی۔ تحفۂ خسروی۔ فرائض والدین۔ مشاہیر سائنس۔ مشکلاتِ قرآن۔ خطبۂ استقبالیہ اور نورانی جہیز ہے۔ عہد اقبال کے ایک سلجھے ہوئے ادیب کی حیثیت سے عبدالماجد دریابادی نے ادب اور مذہب کی بیک وقت نمائندگی کی اور ان کی تصانیف سے ان کی علمی و ادبی ہمہ گیری کا پتہ چلتا ہے

25.6.6 مولوی عبدالحق

ایک ادبی محقق، نقاد، مرتب متن، خاکہ نگار، ادبی صحافی، خطبہ نویس، مکتوب نگار، ماہر لسانیات کے علاوہ مبصر اور نصابی کتب کے مدون کی حیثیت سے عہد اقبال میں مولوی عبدالحق کی خدمات کو غیر معمولی اہمیت حاصل ہے۔ بابائے اردو کے خطاب سے نوازے گئے مولوی عبدالحق 20 اپریل 1870ء میں ہاپوڑ کے قریب سرادہ نامی گاؤں میں پیدا ہوئے۔ ان کی ابتدائی تعلیم سرادہ اور ہاپوڑ میں ہوئی۔ اس کے بعد فیروز پور (پنجاب) چلے آئے اور وہاں سے

مڈل امتحان پاس کیا۔ 1888ء میں حصول علم کے لیے علی گڑھ آئے۔ جہاں پروفیسر آرنلڈ اور تھیوڈ ڈبیک جیسی شخصیتوں سے متاثر ہونے کے علاوہ سرسید۔ حالی اور شبلی جیسے اکابر قوم کی تربیت میں پروان چڑھے۔ بی۔ اے کرنے کے بعد 1895ء میں تلاش روزگار میں بمبئی پہنچے۔ محسن الملک کے سکریٹری کے بعد حیدرآباد میں افسر جنگ کے رسالے ''افسر'' کی ادارت قبول کی۔ ہوم آفس میں مترجم کے عہدے پر مامور ہوئے۔ دارالترجمہ جامعہ عثمانیہ قائم ہوا تو اس کے ناظم مقرر ہوئے۔ 1924ء سے 1929ء تک اورنگ آباد کالج کے پرنسپل رہے۔ 1925ء میں کالج کا رسالہ ''نورس'' جاری کیا۔ جامعہ عثمانیہ میں شعبۂ اردو کے صدر اور پروفیسر بنائے گئے۔ قیام اورنگ آباد کے دوران انجمن ترقی اردو کو منظم کیا۔ رسالہ ''اردو'' اور ''سائنس'' جاری کیا۔ کلاسیکی ادب کی کتابیں مرتب کرنے کے علاوہ آصف جاہی مدارس کے لیے نصابی کتابیں مدون کیں۔ دسویں جماعت تک کا اردو نصاب تیار کروایا اسی دوران ان کے خاکوں کا مجموعہ ''چند ہم عصر'' شائع ہوا۔ اردو کے متعدد تذکروں کو مدون کرکے شائع کرنے کا کارنامہ بھی مولوی عبدالحق نے انجام دیا۔ 1937ء میں الہ آباد یونیورسٹی نے انھیں ڈی لٹ کی ڈگری عطا کی اور 1941ء میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے انھیں ڈاکٹریٹ کی اعزازی ڈگری دی۔ پاکستان منتقل ہونے کے بعد 15 نومبر 1959ء کو انھیں ''ہلال قائداعظم'' عطا کیا گیا۔ 1948ء میں انجمن کے ساتھ پاکستان ہجرت کی۔ انجمن ترقی اردو پاکستان کی بنا ڈالی اور اردو کالج قائم کیا۔ کینسر کے مرض میں مبتلا ہوئے اور 16 اگست 1961ء کو انتقال کیا۔ ایک صحافی کی حیثیت سے مولوی عبدالحق نے رسالہ نورس' رسالہ حسن' رسالہ افسر' رسالہ اردو اور رسالہ سائنس کی ادارت سنبھالی۔ تذکروں کے مرتب کی حیثیت سے انھوں نے ''نکات الشعرا' تذکرۂ ریختہ گویاں' مخزن نکات' چمنستان شعرا' گل عجائب' تذکرہ ہندی' ریاض الفصحا اور ''مخزن الشعرا کو شائع کیا۔ 1916ء میں ''دریائے لطافت'' مرتب کرکے شائع کی۔ مولوی عبدالحق کو دکنی کے محقق کا درجہ حاصل ہے۔ انھوں نے گلشن عشق' معراج العاشقین' قطب مشتری اور سب رس کو وقیع مقدمے کے ساتھ شائع کیا۔ اثر کی مثنوی ''خواب وخیال'' کو مرتب کرکے 1926ء میں اورنگ آباد سے شائع کیا۔ ایک محقق کی حیثیت سے ان کے کارنامے کافی وسیع ہیں۔ ''اردو کی نشوونما میں صوفیاء کرام کا کام'' اور ''مرحوم دہلی کالج'' جیسی کتابیں لکھ کر ادبی تحقیق کو پروان چڑھایا۔ غرض مولوی عبدالحق ایک صحافی' خاکہ نگار' محقق' نقاد' مبصر اور مرتب کی حیثیت سے اپنے دور میں شہرت رکھتے ہیں اور یہ بڑی خوش آئند بات ہے کہ بابائے اردو کے تمام تحقیقی' تنقیدی' صحافتی اور ادبی کارنامے عہد اقبال میں انجام دیے گئے مولوی عبدالحق کی وجہ سے دکنی ادبیات کی تحقیق کے نئے گوشے وا ہوئے جنھیں کسی اعتبار سے نظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔

26.6.7 قاضی عبدالغفار

اردو تحریک کے بانی ایک پرجوش اور ہوش مند کارکن کی حیثیت سے قاضی عبدالغفار اپنی شناخت رکھتے ہیں۔ وہ ایک صاحب طرز ادیب' صحافی' انشائیہ نگار اور سوانح نگار کی حیثیت سے پہچانے جاتے ہیں۔ قاضی عبدالغفار مرادآباد کے محلے تمباکو والا میں 1885ء میں پیدا ہوئے۔ ان کی صاحبزادی فاطمہ عالم علی خاں نے ان کی تاریخ پیدائش دسمبر 1889ء بتائی ہے۔ مرادآباد کے انگلش مڈل اسکول میں داخل کیا گیا۔ 1902ء میں مڈل اور 1905ء میں میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ اسی سال علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے ایف۔ اے سال اول میں داخلہ لیا۔ 1910ء میں ان کی شادی خالہ زاد بہن افضال بیگم سے ہوئی۔ علی گڑھ سے لوٹ کر نائب تحصیل دار کے عہدے پر فائز ہوئے اور بہت جلد اس عہدے سے مستعفی ہوگئے۔ ابتدا سے انھیں صحافت سے دلچسپی تھی۔ مرادآباد میں ابن علی کی ادارت میں شائع ہونے والے رسالے ''نیر عالم'' میں ابتدائی مضامین شائع ہوئے۔ 1913ء میں مولانا محمد علی نے رسالہ ''ہمدرد'' میں اپنا اسسٹنٹ مقرر کیا۔ ہمدرد کو پریس ایکٹ کے تحت بند کیا گیا تو قاضی عبدالغفار کلکتہ چلے گئے اور روزنامہ ''جمہور'' جاری کیا۔ اسی دوران ''ترجمان'' اور ''صداقت'' سے وابستہ رہے۔ انھوں نے دہلی سے روزنامہ ''صباح'' جاری کیا۔ حکیم اجمل خاں اور ڈاکٹر انصاری کا قرب حاصل ہوا۔ خلافت کمیٹی کے لندن جانے والے وفد کے سکریٹری مقرر ہوئے۔ 14 فروری 1921ء کو وفد کے ساتھ لندن پہنچے اور 30 اپریل 1921ء کو ہندوستان لوٹے۔ 1925ء میں پیرس میں مرادآبادی برتنوں کی دکان کھولی۔ 1926ء میں میونسپل بورڈ کے چیرمین ہوئے۔ 1932ء میں حیدرآباد سے روزنامہ ''پیام'' جاری کیا۔ سر مرزا اسمٰعیل کی سفارش پر محکمہ اطلاعات کے ناظم مقرر ہوئے۔ تین سال تک اس عہدے پر فائز رہ کر 27 اکتوبر 1947ء کو استعفیٰ دے دیا۔ مولانا آزاد نے 1950ء میں عبدالغفار کو دہلی بلالیا اور دستور ہند کے ترجمہ کی ذمہ داری سونپی۔ انھوں نے ساہتیہ اکیڈیمی کے رکن اور انجمن ترقی اردو کے جنرل سکریٹری کی ذمہ داری نبھائی۔ 17 جنوری 1954ء کو اس جہاں فانی سے کوچ کیا۔ ''لیلیٰ کے خطوط''۔ ''مجنوں کی ڈائری''۔ ''تین پیسے کی چھوکری''۔ ''پندار کا صنم کدہ''۔ ''سیب کا درخت'' اس نے کہا ''نقش فرنگ'' اور ''عجیب'' ان کی تصانیف ہیں۔ ''آثار جمال الدین افغانی''۔ ''آثار ابوالکلام آزاد'' اور ''حیات اجمل'' کے علاوہ سوانحی مضامین بھی ہیں۔ وہ مضمون نگار۔ سوانح نگار۔ کالم نگار۔ صحافی اور مبصر کے حیثیت سے شہرت رکھتے ہیں۔ عہد اقبال میں

عبدالغفار کی صحافت، مضمون نگاری اور کالم نگاری کا شہرہ عام تھا۔ حیدرآباد سے ''پیام'' جاری کر کے شہرت حاصل کی۔ ان کی تخلیقات ادبی معیارات متعین کرنے کی دلیل بنتی ہیں۔

25.6.8 خواجہ حسن نظامی

اردو میں انشائیے، سفرنامے، روزنامچے، صحافت، سوانح، مرقع نگاری، ترجمہ، تاریخ، تفسیر جیسے بے شمار اوصاف کو اختیار کر کے خواجہ حسن نظامی نے اردو کے صاحبِ طرز ادیبوں میں نام کمایا ہے۔ وہ کثیر التصانیف ادیب ہیں۔ حسن نظامی کا خاندانی سلسلہ مشہور صوفی حضرت بابا فریدالدین گنج شکر کے داماد سید بدرالدین اسحاق سے ملتا ہے۔ خواجہ حسن نظامی کی ولادت 25 دسمبر 1878ء کو ہوئی۔ ان کے والد نے نام قاسم علی رکھا جب کہ ماموں نے علی حسن کے نام سے یاد کیا۔ ان کے والد عاشق علی کے ذرائع محدود تھے۔ حسن نظامی کا بچپن عسرت میں گزرا۔ وہ عربی اور فارسی زبانوں سے بخوبی واقف تھے لیکن انگریزی سے نابلد رہے۔ گیارہ برس کی عمر میں شاہ الہ بخش (ڈیرہ غازی خاں) سے ارادت حاصل کی اور خواجہ غلام فرید کے ہاتھ پر بیعت کی۔ ان کا پہلا مضمون ''انڈیا کی نازک حالت''۔ ''انڈیا گزٹ'' بمبئی میں چھپا۔ حضرت جلال الدین سیوطی کے عربی رسالے کا ترجمہ ''مفلسی کا مجرب علاج'' ان کی پہلی تصنیف ہے۔ بھاولپور اور پنجاب کے سفر کے بعد 1905ء اور 1906ء میں متھرا۔ ایودھیا۔ بنارس۔ ہردوار اور رشی کیش کا سفر کیا۔ 1908ء میں ''حلقہ نظام المشائخ'' قائم کیا۔ 1909ء میں ملا واحدی کے اشتراک سے رسالہ ''نظام المشائخ'' جاری کیا۔ 1911ء میں مصر، شام اور حجاز روانہ ہوئے اور سفرنامہ ''نظام المشائخ'' میں شائع ہوا۔ 1913ء میں ''اخبار توحید'' جاری کیا۔ ''کبوتکبیر'' مضمون کی اشاعت پر انگریزوں نے اسے بند کر دیا۔ رسالہ ''منادی'' 1926ء میں جاری کیا۔ 1925ء میں نظام الاسلام کے نام سے مدرسہ 1939ء میں دہلی میں ''اردو کلب'' قائم کیا۔ 2 جنوری 1946ء کو حکومت برطانیہ نے انھیں شمس العلماء کا خطاب عطا کیا۔ 31 جولائی 1955ء میں عیدالضحیٰ کے دن مغرب کی نماز کے بعد داعی اجل کو لبیک کہا۔ ان کی تخلیقی یادگاریں ''آپ بیتی''۔ ''بیگمات کے آنسو''۔ ''سی پارۂ دل''۔ ''بیوی کی تعلیم''۔ ''بہادر شاہ ظفر کا روزنامہ''۔ ''جگ بیتی کہانیاں''۔ ''چار درویشوں کا تذکرہ''۔ ''خوشی کی زندگی''۔ ''دلی کی جانکنی''۔ ''سفرنامۂ حجاز''۔ ''مصر و شام''۔ ''طب کی تاریخ''۔ ''طمانچہ بر خسار یزید''۔ ''لڑائی کا گھر''۔ ''عام فہم تفسیر''۔ ''فرعونی تاریخ'' وغیرہ ہیں۔ قلمی چہرے اور خاکے لکھنے میں انھیں کمال حاصل تھا۔ انھوں نے اللہ میاں۔ شیطان اور ماڈرن معشوق کے جو مرقع قلم بند کیے ہیں۔ وہ خاصے دلچسپ ہیں۔ ان کی سوانح نگاری بھی خاصہ کی چیز ہے۔ ''آپ بیتی'' ان کی خودنوشت سوانح ہے۔ منادی میں ان کے روزنامچے سلسلہ وار شائع ہوئے۔ کتابوں کے مطالعے سے ان کی فکر باریک مشاہدے اور ژرف نگاری کا ثبوت ملتا ہے۔ علامہ اقبال کے عہد کے وہ ایک ایسے قلم کار ہیں جنھوں نے اقبال کی مخالفت کی لیکن بعد میں اقبال کی حمایت پر توجہ دی۔ اس طرح وہ عہد اقبال کے ایک اہم نثر نگار کا درجہ رکھتے ہیں۔

25.6.9 برج موہن دتاتریہ کیفی

اردو کے ایک بہترین مترجم، تذکرہ نویس، ماہر زبان و قواعد، ڈراما اور ناول نگار، شاعر اور لسانیات کے مختلف میدانوں میں اپنی صلاحیتوں کو اجاگر کرنے والے برج موہن دتاتریہ کیفی 1886ء کو دہلی میں کشمیری پنڈتوں کے ایک خوشحال گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ان کے بزرگ فرخ سیر کے زمانے میں کشمیر سے دلی چلے آئے تھے۔ ان کے والد پنڈت کنہیالال شہر نابھہ کے کوتوال تھے۔ بازار سیتارام محلہ کے مدرسہ سے کیفی کی تعلیم کا آغاز ہوا۔ ان کے نانا نے فارسی کی معیاری کتابیں پڑھائیں۔ پرائمری اسکول میں انگریزی سیکھی۔ شاہ جی کے چھتے کے سرکاری اسکول میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد اسٹیفن کالج دہلی سے بی۔ اے کیا۔ انگریزی، عربی، فارسی اور سنسکرت زبانیں سیکھ لیں۔ لکھنو کے ایک قدیم گھرانے کی لڑکی سے ان کی شادی ہوئی۔ انگریزی اخبار ''ٹری بیون'' لاہور میں کام کیا۔ کیفی نے یوروپ اور انگلستان کا دورہ کر کے 1916ء میں ہندوستان کا رخ کیا۔ جب راجا دلجیت سنگھ کشمیر کے وزیراعظم مقرر ہوئے تو کیفی کو کشمیر بلالیا اور وہ کشمیر میں اسسٹنٹ خازن سکریٹری مقرر ہوئے۔ وہاں سے سبکدوش ہونے کے بعد پہاڑی ریاست چینی میں مجسٹریٹ اور کلکٹر کے فرائض انجام دیے۔ 1939ء میں کشمیر میں انجمن ترقی اردو کی بنا ڈالی۔ لالہ سری رام نے ''خمخانۂ جاوید'' کی چار جلد مکمل کیں تھیں کہ 1930ء میں ان کا انتقال ہوگیا۔ مولوی عبدالحق نے بقیہ جلدوں کی تکمیل کا کام کیفی کے سپرد کیا۔ اس کی پانچویں جلدیں 1940ء دہلی میں شائع ہوئی۔ 1945ء میں پہلی بار کیفی کے قلب پر حملہ ہوا۔ 1954ء میں آنکھ کے آپریشن کے بعد کیفی نے اپنے بھتیجے کے مکان واقع غازی آباد میں سکونت اختیار کی اور وہیں یکم نومبر 1955ء کو اس دار فانی سے کوچ کیا۔ ان کی کتابیں ''کیفیہ'' اٹھارہ ابواب پر مشتمل اردو املا اور ادب کی مختصر تاریخ ہے جو 1942ء میں شائع ہوئی ''خمسہ کیفی''، تین مقالات اور ''منشورات'' لسانی جائزے پر مشتمل ہے۔ علامہ اقبال کے عہد میں علمی خدمات انجام دینے میں کیفی کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔

25.6.10 سید سلیمان ندوی

گراں قدر علمی خدمات اور تحقیقی وقار کی وجہ سے سید سلیمان ندوی اپنے عہد کے مصنفین میں امتیازی حیثیت کے حامل ہیں۔ان کے خاندان کا تعلق بہار شریف کے گاؤں دسنہ سے تھا۔ان کے بزرگ اکبر کے زمانے میں وارد ہندوستان ہوئے اور ''دین الٰہی'' کی مخالفت کی بنیاد پر جام شہادت نوش کیا۔سلیمان ندوی کی تاریخ ولادت 22 نومبر 1884ء بتائی جاتی ہے۔ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کی۔ 1901ء میں دارالعلوم ندوۃ العلماء میں داخل ہوئے اور شبلی سے استفادے کا موقع ملا۔شبلی نے انھیں ''الندوہ'' کی ذمہ داری سونپی۔جولائی 1912ء میں کلکتہ سے ابوالکلام آزاد نے ''الہلال'' جاری کیا تو سلیمان ندوی اس کے عملے میں شامل ہوگئے۔دکن کالج پونے میں فارسی کے اسسٹنٹ لکچرر کی جگہ نکلی تو شبلی نے سلیمان ندوی کا تقرر کروادیا۔سلیمان ندوی نے وہاں انگریزی سیکھی اور علمی مشاغل جاری رکھے۔انھوں نے ''ارض القرآن'' کا پہلا حصہ مکمل کیا تھا کہ شبلی کا انتقال ہوگیا۔''سیرت النبی'' کا نامکمل کام سلیمان ندوی کے سپرد ہوا۔دارالمصنفین کے لیے شبلی نے اپنا گھر اور باغ مختص کیا تھا۔شبلی کے شاگردوں نے اس کام کو آگے بڑھایا۔علامہ اقبال چاہتے تھے کہ سلیمان ندوی کے علم وفضل سے اہل پنجاب مستفید ہوں چنانچہ اورینٹل کالج لاہور میں جب فارسی کی جگہ خالی ہوئی تو اقبال نے انھیں وہاں مدعو کیا۔سلیمان ندوی نے معذرت چاہی۔1916ء میں دارالمصنفین کا پریس قائم ہوا اور ماہنامہ ''معارف'' کا پہلا شمارہ شائع ہوا۔انھوں نے مسلمانوں کا اعتماد حاصل کیا چنانچہ 1920ء کے خلافت کمیٹی کے وفد میں سلیمان ندوی شامل تھے جس نے لندن میں نمائندگی کی۔فروری 1942ء میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے انھیں ڈاکٹریٹ کی ڈگری دی۔والیِ ریاست بھوپال یہ چاہتے تھے سلیمان ندوی بھوپال میں رہ کر علمی وادبی کام کریں چنانچہ 1950ء تک وہ بھوپال میں رہے۔اسی سال پاکستان پہنچے۔کراچی یونیورسٹی کے سینٹ کے رکن رہے۔ان کی غیر معمولی ادبی تصانیف میں ''خیام'' اور ''نقوش سلیمانی'' کو اہمیت حاصل ہے جو تحقیقی بصیرت اور اعلیٰ ادبی صلاحیت کی غماز ہیں۔

سیرت نگاری پر سلیمان ندوی کی کتابیں ''سیرت عائشہ''۔''حیات شبلی''۔''سیرت النبی ﷺ''۔اہمیت کی حامل ہیں۔''خطباتِ مدراس''، تحقیقی انداز کی نمائندگی کرتی ہے۔عبدالقوی دسنوی نے بہار اردو اکادمی کی جانب سے 1984ء میں ''یادگار سلیمان'' شائع کی۔غرض سید سلیمان ندوی ایک کامیاب صحافی، شاعر، سوانح نگار، دانشور، محقق۔نقاد اور ادیب تھے جن سے اقبال کے دیرینہ تعلقات تھے اور اقبال کے عہد میں اسلامی روح کو پھیلانے میں انھوں نے اہم کارنامے انجام دیے۔

اپنی معلومات کی جانچ:

1. عہد اقبال کی چند غیر افسانوی اصناف کون سی ہیں؟
2. اقبال کے عہد کے کوئی پانچ اہم غیر افسانوی نثر نگاروں کے بتائیے؟

25.7 عہد اقبال میں طنز ومزاح

علمی، ادبی اور صحافتی نثر کے علاوہ عہد اقبال میں ایسی نثر کا بھی شہرہ رہا جس کے ذریعہ طنز وظرافت کی نمائندگی کی گئی۔سرسید کے عہد میں ہی ''اودھ پنچ'' کی صحافت کے ذریعے طنز وظرافت کا آغاز ہو چکا تھا اور نثر نگاروں کے علاوہ شعرا نے بھی طنز وظرافت کے رویے کو اختیار کیا۔ایسی تحریریں جن کے ذریعے ہنسنے اور ہنسانے کے مواقع فراہم کیے جائیں انھیں مزاح یا ظرافت کی سرشت میں شمار کیا جاتا ہے اور اگر کسی تحریر کے مطالعہ کے بعد ہنسنے کے علاوہ افسوس اور ندامت کا عمل بھی ظرافت کے ساتھ شامل ہو جائے تو اسے طنز کہا جاتا ہے۔انگریزی میں Humour اور Satire کے الفاظ بطور متبادل استعمال ہوتے ہیں۔طنز اور مزاح کے دوران جس قدر تہہ داری اور معنویت ہوگی اسی قدر لطف کے مواقع فراہم ہوتے ہیں ورنہ طنز ومزاح پھکڑ پن یا دل آزاری کا ذریعہ بن جاتا۔جس سے پتہ چلتا ہے کہ نہ تو طنز وظرافت کا مقصد کسی کی دل آزاری ہے اور نہ خندہ آوری بلکہ اس کے ذریعے بھی قاری کی فہم وفراست کو تیز کرنے کا کام لیا جاتا ہے۔''اودھ پنچ'' کے نثر نگاروں نے ہنسی، مذاق اور بذلہ سنجی کے لیے طنز ومزاح کو استعمال کیا لیکن رفتہ رفتہ شائستہ ظرافت اور لطیف جملوں سے طنز کو رواج دینے کا انداز اردو میں عام ہوتا گیا۔علامہ اقبال کے عہد تک لکھنوی طرز وانداز پر طنز ومزاح کے تیر برسانے میں پنڈت رتن ناتھ سرشار پیش پیش تھے۔منشی سجاد حسین، مچھو بیگ ستم ظریف، تربھون ناتھ ہجر، جوالا پرشاد برق، احمد علی شوق اور سید محمد آزاد نے اس دور کی مصنوعی زندگی اور تصنع

کا مذاق اڑایا۔ میاں آزاد۔ خوجی۔ حاجی بغلول افیونی۔ عیار۔ بہروپیے کے کرداروں سے سماج کے ناسور کریدنے کی کوشش کی گئی۔ غالب کی نثر اور اکبر الٰہ آبادی کی شاعری میں طنز و مزاح کے لطیف جذبات کی نمائندگی ہوتی ہے اور اسی روش پر عہد اقبال میں طنز و مزاح کا کارواں آگے بڑھتا ہے۔

25.7.1 مُلّا رموزی

مزاح کے میدان میں ''گلابی اردو'' کی معرفت سے جس نثر نگار کو انفرادیت حاصل ہے وہ ملا رموزی ہیں۔ ان کا اصلی نام صدیق ارشاد تھا۔ 31 مئی 1896ء کو بھوپال میں پیدا ہوئے۔ گھر پر اردو، عربی اور فارسی کی تعلیم حاصل کی پھر کانپور کے ''مدرسۂ الٰہیات'' میں داخل ہوئے۔ اسی دوران مضمون نگاری کا آغاز کیا۔ 1918ء میں تعلیم سے فارغ ہو کر بھوپال لوٹے۔ 1921ء میں ملا رموزی کی کتاب ''گلابی اردو'' شائع ہوئی۔ جو کافی مقبول ہوئی۔ وحیدیہ ٹکنیکل اسکول میں مدرس کی حیثیت سے کام کیا۔ ان کی نثر میں چھوٹے چھوٹے فقرے بڑا مزے دے جاتے ہیں۔ رموزی نے کانگریس کی حمایت کی۔ ان کے ہر جملہ سے طنز ابھرتا ہے۔ 1928ء میں دارالاشاعت پنجاب سے ''نکات رموزی'' شائع ہوئی۔ انھوں نے اپنے مضامین میں سیاسی اور تہذیبی ناہمواریوں کو ہدف بنایا ہے۔ مزاح سے طبعی مناسبت کی وجہ سے ان کی تحریریں شگفتہ اور دلچسپ بن جاتی ہیں۔ سائنسی ایجادات ان کی نگاہ میں کھٹکتی ہیں۔ ان کے مضامین کسان۔ ریل۔ لیڈر۔ تعلیم یافتہ خاتون۔ پبلک۔ ہندستان میں معقولیت بھی ہے اور طنز و مزاح کی لطافت بھی۔ اقبال کے عہد کے ایک اہم طنزیہ و مزاحیہ نثر نگار کی حیثیت سے ملا رموزی کی شہرت رہی۔

25.7.2 مرزا فرحت اللہ بیگ

مخصوص انداز میں مزاح نگاری کو فروغ دینے والے نثر نگار کی حیثیت سے مرزا فرحت اللہ بیگ بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔ 1883ء میں بمقام دہلی پیدا ہوئے۔ ان کے جد اعلیٰ شاہ عالم ثانی کے زمانے میں ترکستان سے وارد ہوئے۔ ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کی۔ 1905ء میں ہندو کالج سے بی۔ اے کیا اور دو سال بعد 1907ء میں ملازمت کی تلاش میں حیدر آباد کا رخ کیا۔ مختلف ملازمتیں کیں۔ اپنی محنت اور قابلیت سے اسسٹنٹ ہوم سکریٹری کے عہدہ پر تقرر ہوا۔ آگرہ کے رسالے ''افادہ'' میں ان کا پہلا مضمون 1919ء میں شائع ہوا۔ باضابطہ مضمون نگاری کا آغاز 1923ء میں ہوا۔ انھیں اردو دنیا میں مرزا الم نشرح کی حیثیت سے شہرت ہوئی۔ انھوں نے اخلاق، سوانح اور مزاح کے ذریعے اپنے خیالات اور افکار پیش کیے۔ مرزا فرحت اللہ بیگ کی رحلت 27 اپریل 1947ء کو ہوئی۔ فرحت اللہ بیگ کے مضامین سات جلدوں میں شائع ہو چکے ہیں۔ وہ محاورات اور روزمرہ کے استعمال سے مزاح پیدا کرنے کے قائل ہیں۔ انھیں دہلوی زبان پر دسترس حاصل ہے۔ ڈپٹی نذیر احمد کی کہانی ''کچھ ان کی کچھ میری زبانی'' ان کی مزاح نگاری کی شاہکار کتاب ہے جس میں قلمی خاکہ اور مرقع نگاری کا حسن پیوست ہے۔ زندہ دلی، انبساط اور تبسم ریزی ان کی نثر کی خصوصیات ہیں۔ بے ساختہ جملوں سے مزاح پیدا کرنے میں انھیں کمال حاصل ہے۔ ان کی مضامین میں ''مردہ بہ دست زندہ''۔ ''ایک وصیت کی تکمیل''۔ ''پرانی اور نئی تہذیب کی ٹکر''۔ ''صاحب بہادر'' اور ''دہلی کی آخری شمع'' کافی مقبول ہیں۔ پھول والوں کی سیر سنجیدہ مضمون کی علامت بن جاتا ہے۔ غرض عہد اقبال میں مزاحیہ نثر نگار کی حیثیت سے مرزا فرحت اللہ بیگ اپنی انفرادی شناخت رکھتے تھے۔

25.7.3 شوکت تھانوی

عام قاری کے پسندیدہ اور محبوب مزاح نگار کی حیثیت سے شوکت تھانوی کا نام کافی بلند ہے۔ ان کا نام محمد عمر تھا۔ ان کی پیدائش 2 فبروری 1904ء کو ہوئی۔ ان کا آبائی وطن تھانہ، مظفر نگر تھا۔ اس لیے نام کے ساتھ تھانوی کا لاحقہ لگایا۔ ان کے والد صدیق احمد نے پنشن لے کر بھوپال میں قیام کیا پھر لکھنؤ چلے آئے۔ شوکت تھانوی کی ذہنی تربیت لکھنو میں ہوئی۔ ابتدا میں مختلف اخبارات میں کام کرتے رہے پھر لکھنو چلے آئے۔ شوکت تھانوی کی ذہنی تربیت لکھنؤ میں ہوئی۔ ابتدا میں مختلف اخبارات میں کام کرتے رہے پھر محکمۂ نشر و اشاعت میں ملازمت مل گئی۔ ملک تقسیم ہوا تو پاکستان ریڈیو میں کام کرنے لگے اور 4 مئی 1963ء کو لاہور میں انتقال کیا۔ ان کے مضامین کی تعداد کم نہیں۔ طنزیہ اور مزاحیہ مضامین کے ساتھ مزاحیہ ناول نگاری کی طرف بھی توجہ دی۔ مزاحیہ غزل گوئی میں بھی طبع آزمائی کی۔ ان کے مزاحیہ مضامین کے مجموعے ''گہرستان۔ موج تبسم۔ بحر تبسم۔ سیلاب تبسم اور طوفان تبسم ہیں۔ خاکوں کی شکل میں انھوں نے ''شیش محل'' پیش کیا۔ انشائیہ نما تحریریں۔ افسانہ نگاری اور ناول نگاری کے ذریعہ انھوں نے ہنسی مذاق کے مواقع فراہم کیے۔ خدا نخواستہ۔ بکواس۔ پگلی۔ نیلوفر۔ ڈھونگ۔ کتیا اور سسرال وغیرہ ان کے مزاحیہ ناول ہیں۔ ان کا ہلکا پھلکا طنز و مزاح سودیشی ریل۔ تعزیت اور چھلانگ وغیرہ

میں نمایاں ہوتا ہے۔شوکت تھانوی نے مزاحیہ ظرافت کے اچھے نمونے پیش کیے۔عہد اقبال کے طنزیہ ومزاحیہ نثر نگار کی حیثیت سے شوکت تھانوی کے کارناموں کونظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔

25.7.4 پطرس بخاری

اردو نثر میں مزاحیہ ادب کے ذریعے اعلیٰ درجے کی تصویر کشی اور مزاح کے مرقع تحریر کرنے میں سید احمد شاہ بخاری پطرس کو اہم مقام حاصل ہے۔ وہ یکم اکتوبر 1898ء کو بمقام پشاور پیدا ہوئے۔ان کے والد کا نام اسد اللہ شاہ بخاری تھا۔ابتدائی تعلیم پشاور میں ہوئی۔گورنمنٹ کالج لاہور میں اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔تعلیم سے فراغت کے بعد لندن کا رخ کیا اور کیمبرج یونیورسٹی میں تعلیم کے چھ سال بعد ہندوستان لوٹے۔ٹریننگ کالج اور پھر گورنمنٹ کالج لاہور میں انگریزی کے پروفیسر کی حیثیت سے ان کا تقرر عمل میں آیا۔1937ء میں آل انڈیا ریڈیو کا محکمہ قائم ہوا تو اس کے اسسٹنٹ کنٹرولر مقرر ہوئے۔ کچھ عرصہ بعد گورنمنٹ کالج لاہور کے پروفیسر بنے اور تقسیم ہند کے بعد وہیں مقیم رہے۔انھوں نے پاکستان کی بین الاقوامی کانفرنس میں حصہ لیا۔1955ء میں اقوام متحدہ کے شعبۂ اطلاعات کے سکریٹری بنا دیے گئے۔پطرس نے 5 دسمبر 1958ء کی صبح کو نیویارک میں انتقال کیا اور وہیں پیوند خاک ہوئے۔ پطرس نے سفرنامے بھی لکھے اور علمی وتنقیدی مضامین کی طرف بھی توجہ دی۔ان کی شہرت کا انحصار ''مضامین پطرس'' پر ہے جو طنزیہ ومزاحیہ ادب میں اہمیت کی حامل کتاب ہے۔اردو کے بلند پایہ مزاح نگاروں میں ان کا شمار ہوتا ہے اور انھوں نے زندگی کی ناہمواریوں کو مزاح کے انداز میں نمایاں کیا ہے۔ان کے مضامین میں ''کتے''۔''مرحوم کی یاد میں''۔''سویرے جو کل آنکھ میری کھلی''۔''ہاسٹل میں پڑھنا''۔''مرید پور کا پیر''۔''سینما کا عشق'' میں زندہ دلی، خوش طبعی اور ظرافت کوٹ کوٹ کر بھری ہے۔جن کے مطالعے سے ان کے شعوری عمل کا پتہ چلتا ہے۔اردو طنز ومزاح کی تاریخ میں پطرس کا نام بے حد اہم ہے۔

25.7.5 مرزا عظیم بیگ چغتائی

1895ء میں جودھپور میں پیدا ہونے والے مرزا عظیم بیگ چغتائی ایک ناول نگار اور افسانہ نگار کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں۔حالانکہ ان کی تحریروں میں طنز ومزاح کا عنصر نمایاں ہے۔کم عمری میں افسانہ نگاری کی بنیاد رکھی۔ان کا پہلا افسانہ ''انگوٹھی کی مصیبت''۔''نیرنگ خیال'' کے سالنامے میں شائع ہوا۔دوران تعلیم ان کی شادی ہوگئی۔انٹرنس اور بی۔اے پاس کرنے کے بعد وکالت کی تعلیم حاصل کی اور جودھپور میں وکالت شروع کی۔بعد میں نواب آف جاورہ نے انھیں اپنی ریاست کا چیف جج بنا دیا۔ان کی تخلیقات میں مرقع کشی موجود ہے۔انھوں نے 32 تصانیف سپرد قلم کیں۔تحریروں کے دوران شوخی، چلبلا پن۔شگفتہ مزاجی۔زندہ دلی اور توانائی اپنا اثر دکھاتی ہے۔ان کا پہلا ناول ''شیریں بیوی'' ہے۔''چغتائی'' کو ان کا بہترین ناول قرار دیا جاسکتا ہے۔اس کے علاوہ ''خانم''۔''کولتار''۔''کمزوری'' اور ''کھرپا بہادر'' ہیں جن میں طنز وظرافت کی جھلکیاں نمایاں ہیں۔افسانوں میں ''روح ظرافت''۔''روحِ لطافت''۔''خاتم''۔''پھریری''۔''انگوٹھی کی مصیبت''۔''چینی کی انگوٹھی'' اور ''لوٹے کا راز''۔''خطوط کی ستم ظریفی''۔''شہزادی''۔''جنت کا بھوت'' ''سوانہ کی روحیں''۔''فرض مقراض محبت است'' سے خود اندازہ ہوتا ہے کہ عظیم بیگ چغتائی نے افسانوی نثر کے دوران طنز ومزاح نگاری کی روایت کو فروغ دیا۔لکھنو کی مٹتی ہوئی تہذیب کو ہدف بنا کر ڈراما 'مرزا جنگی' لکھا۔اسی طرح سنجیدہ موضوع پر کتاب ''قرآن اور پردہ'' تحریر کی۔ان کی تحریروں میں ظرافت اور مزاح کے ساتھ ہی پھکڑ پن بھی اثر دکھاتا ہے۔فضلِ حق قریشی نے انھیں ''مصور ظرافت'' کے نام سے موسوم کیا۔انتہائی نحیف تھے اور صحت پر توجہ نہ دینے کی وجہ سے علالت میں اضافہ ہوا اور 1961ء میں انتقال کیا۔

25.7.6 رشید احمد صدیقی

متوازن مزاح اور طنز کے تیر برسانے کے لیے مضمون نگاری، خاکہ نگاری اور مرقع کاری کو وسیلہ کے طور پر استعمال کرنے والے ادیبوں میں رشید احمد صدیقی کا شمار ہوتا ہے۔وہ 25 دسمبر 1894ء میں قصبہ پریا ضلع بلیا میں پیدا ہوئے۔ابتدائی تعلیم قدیم رواج کے مطابق گھر پر مولوی صاحب سے دینیات، اردو، عربی اور فارسی کے ذریعے ہوئی۔جس کے بعد جونپور کے اسکول میں داخل کیے گئے۔1905ء میں چوتھی جماعت میں شریک ہوئے۔ 1914ء میں انٹرنس کا امتحان پاس کیا۔انھیں کرکٹ، ہاکی اور فٹبال سے بڑی دلچسپی تھی۔علی گڑھ سے ایم۔اے پاس کیا۔وائس چانسلر ضیاء الدین نے 1923ء میں انھیں اردو پڑھانے پر مامور کیا۔1926ء میں ملازمت مستقل ہوئی۔علی گڑھ اور جامعہ عثمانیہ میں اردو کے استاد رہے۔1963ء میں ادبی

خدمات کے اعتراف میں رشید احمد صدیقی کو پدم شری عطا کیا گیا۔ 1971ء میں غالب اکیڈیمی ایوارڈ اور 1974ء میں اتر پردیش اردو اکاڈمی کا ادبی اعزاز حاصل ہوا۔ انھوں نے 1977ء میں وفات پائی اردو کے بلند پایہ طنز و مزاح نگاروں میں شمار کیے جاتے ہیں۔ ان کی تصانیف میں ''طنزیات و مضحکات''۔ ''مضامین رشید''۔ ''خنداں''۔ ''گنج ہائے گرانمایہ''۔ ''آشفتہ بیانی میری''۔ ''جدید غزل''۔ ''ڈاکر صاحب''۔ ''سہیل کی سرگزشت'' اور ''ہم نفسانِ رفتہ'' ادبی اہمیت کے حامل ہیں۔ مزاحیہ تاثراتی انداز کی وجہ سے رشید احمد صدیقی ادب میں اہم مقام رکھتے ہیں۔ موضوعات کا تنوع اور تہہ دار معنویت ان کے طنز و مزاح کی سب سے بڑی دلیل ہے وہ روزمرہ اور اپنے گرد و پیش کے ماحول سے بذلہ سنجی کا ماحول پیدا کر دیتے ہیں۔ ''وکیل''۔ ''چار پائی''۔ ''دیہاتی ڈاکٹر''۔ ''ارہر کا کھیت'' مزاحیہ تاثر پیدا کرنے کے اہم ذرائع ہیں۔ فقروں کی چستی، جملوں کی دروبست اور لفظوں کے مناسب استعمال سے ان کی تحریروں میں ظرافت پیدا ہوتی ہے۔ عہد اقبال میں رشید احمد صدیقی کے طنزیہ و مزاحیہ ادب کی دھوم تھی۔ اگر چہ وہ دورِ اقبال کے نثر نگاروں میں کم عمر تھے لیکن ادبی محفلوں میں ان کی تحریروں کو قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ غرض عہد اقبال کے طنز و مزاح نگاروں کے قافلے میں رشید احمد صدیقی اپنی انفرادیت رکھتے ہیں۔

اپنی معلومات کی جانچ:

1. طنزیہ و مزاحیہ نثر کسے کہتے ہیں؟
2. طنزیہ و مزاحیہ نثر کی چند اصناف لکھیے۔
3. اقبال کے عہد کے نامور طنز و مزاح کے نثر نگار کون ہیں؟

25.8 خلاصہ

علامہ اقبال کے عہد میں ہندوستان کی فضاؤں میں جہاں نثر و شاعری کے چرچے تھے وہیں کئی شعری و نثری اصناف کے فروغ کا سلسلہ جاری تھا۔ علامہ اقبال نے اپنے دور میں مضمون، مقالہ، مراسلہ، مکتوب نگاری کے توسط سے غیر افسانوی نثر کی نمائندگی کی اور انھوں نے تمام عمر افسانوی نثر کی طرف کوئی خاص توجہ نہیں دی لیکن اقبال کے عہد کو سمجھنے کے لیے اس دور کی تمام تر نثر کا احاطہ ضروری ہے عہد اقبال کی نثر کو تین زمروں میں تقسیم کر کے سب سے پہلے افسانوی نثر کے نمائندہ قلم کاروں کے کارناموں کا احاطہ کیا گیا ہے۔ چنانچہ اقبال کے دور میں ناول، افسانہ اور ڈراما جیسی اصناف کی نمائندگی کرنے والے تخلیق کاروں اور ان کے کارناموں کے ذریعے ثابت کیا گیا کہ عبدالحلیم شرر۔ منشی پریم چند۔ علامہ راشد الخیری۔ مرزا محمد ہادی رسوا اور منشی فیاض علی ایڈوکیٹ کی ناول نگاری عروج پر تھی اور اسی وقت اقبال نے مکتوب نگاری کی روایت کو پروان چڑھایا۔ اقبال کے عہد میں جن افسانہ نگاروں نے شہرت حاصل کی ان میں پریم چند۔ سجاد حیدر یلدرم۔ سدرشن۔ علی عباس حسینی کے نام پیش پیش ہیں جن کی تخلیقات اردو دنیا میں منظر عام پر آ چکی تھیں۔ اس دور کے ڈراما نگاروں میں آغا حشر کاشمیری۔ حکیم احمد شجاع۔ سید مہدی حسن احسن۔ نرائن پرشاد بے تاب کے علاوہ امتیاز علی تاج نے اس فن کی آبیاری میں حصہ لیا تھا جس کی وجہ سے افسانوی نثر میں کئی اصناف کی باریابی ہو سکی۔ اسی طرح غیر افسانوی نثر میں خاکہ، سوانح، سفرنامہ، خودنوشت، تحقیق، تنقید، مضمون، انشائیہ، مکتوب نگاری وغیرہ جیسی اصناف کے نمائندہ تخلیق کاروں کا جائزہ لیتے ہوئے ثابت کیا گیا ہے کہ عہد اقبال میں مولانا ابوالکلام۔ نیاز فتح پوری۔ مہدی افادی۔ ظفر علی خاں۔ عبدالماجد دریابادی۔ مولوی عبدالحق۔ قاضی عبدالغفار۔ خواجہ حسن نظامی۔ برج موہن دتاتریہ کیفی اور سید سلیمان ندوی جیسے ادیبوں نے ادبی اصناف کے علاوہ صحافت اور اس کے کالموں کے ذریعے قلم کے جوہر دکھائے عہد اقبال میں افسانوی اور غیر افسانوی نثر کے علاوہ طنز و مزاح کو بھی فروغ حاصل ہوا چنانچہ اس طرز کو فروغ دینے والے نثر نگاروں کا تعارف کرتے ہوئے یہ بات واضح کی گئی کہ عہد اقبال نثر کے فروغ میں اہمیت کا حامل ہے۔ اقبال کے عہد میں جن طنز و مزاح نگاروں نے نثر کی خدمت کی ان میں ملا رموزی۔ مرزا فرحت اللہ بیگ۔ شوکت تھانوی۔ پطرس بخاری۔ عظیم بیگ چغتائی اور رشید احمد صدیقی کی طنزیہ و مزاحیہ تخلیقات کے احاطے سے ثابت کیا گیا ہے کہ اقبال کے عہد میں اردو نثر نہ صرف افسانوی، غیر افسانوی، طنزیہ و مزاحیہ بلکہ سنجیدہ طرز سے مالا مال تھی اور اس دور میں نثر کی ہر صنف اپنے عروج کو پہنچ چکی تھی۔ جس کی وجہ سے اقبال کی نثر میں بھی اس دور کا پرتو دکھائی دیتا ہے۔

25.9 نمونۂ امتحانی سوالات

1. اقبال کے عہد کی نثر کو کتنے حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے؟
2. اقبال کے دور کی افسانوی نثر کے بارے میں آپ کیا جانتے ہیں؟
3. عہدِ اقبال کی غیر افسانوی نثر کا تعارف کروایے۔
4. اقبال کے عہد میں طنزیہ ومزاحیہ نثر کا فروغ کیسے ہوا؟
5. اقبال کے دور کے چند اہم ناول نگاروں کے بارے میں اظہار خیال کیجیے۔
6. اقبال کے دور کے اہم افسانہ نگاروں کا تعارف کیجیے۔
7. اقبال کے دور میں ڈراما کی ترقی پر ایک نوٹ لکھیے۔
8. عہدِ اقبال کی غیر افسانوی نثر کا جائزہ لیجیے۔
9. طنزیہ اور مزاحیہ نگاروں نے عہدِ اقبال میں کیا کارنامے انجام دیے؟

25.10 فرہنگ

الفاظ	=	معنی	الفاظ	=	معنی	الفاظ	معنی
توسط	=	ذریعہ۔وسیلہ	مستحکم	=	پکا۔مضبوط۔	ہمہ جہتی	= تمام طریقے
مایہ ناز	=	فخر کا سبب	ترجمانی	=	نمائندگی	جہت	= سمت
توضیح	=	کھول کر بیان کرنا	تشریح	=	وضاحت	تفہیم	= سمجھانا
نصاب	=	پڑھائی کا کورس	مرقع	=	تصویروں کی کتاب	چابکدستی	= چالاکی۔تیزی
حریت	=	حقانیت کا جذبہ	جہاد	=	جدوجہد، کوشش	نسوانی	= عورتوں سے متعلق
سراب	=	دھوکہ۔فریب	قفس	=	پنجرا۔پھندا۔جیل	شرف	= بزرگی۔برتری
عبور	=	پل پر سے گزرنا، مہارت حاصل کرنا	سکونت	=	مستقل قیام	مستفید	= فائدہ اٹھانا
عصری	=	زمانے سے متعلق	حسیت	=	محسوس کرنے کا عمل	فوت	= معدوم
ولادت	=	پیدائش	مؤثر	=	کارگر۔اثر کرنے والا	فراموش	= بھولا ہوا
حرص	=	خواہش۔ہوس	مداح	=	تعریف کرنے والا	جانباز	= جان پر کھیلنے والا
غلبہ	=	برتری۔فوقیت	صعوبت	=	سختی۔تکلیف	گویا	= گانے والا۔حقیقی
ثقافت	=	تہذیب۔کلچر	ملفوظات	=	زبان سے ادا شدہ جملے	اکابر	= بڑے لوگ۔مقتدر آدمی
مدون	=	جمع کیا ہوا۔مرتب	وفد	=	نمائندہ جماعت	ژرف نگاہی	= گہری نظر
بذلہ سنجی	=	خوش طبعی۔لطیفہ گوئی					

25.11 سفارش کردہ کتابیں

.1	سید اعجاز حسین	مختصر تاریخ ادب اردو
.2	حالی بک ڈپو	مصنفین اردو
.3	پروفیسر سیدہ جعفر	تاریخ ادب اردو (جلد اول تا سوم)۔عہد میر سے ترقی پسند تحریک تک
.4	ابواللیث صدیقی	آج کا اردو ادب
.5	نامی انصاری	بیسویں صدی میں طنز و مزاح
.6	پروفیسر یوسف سرمست	بیسویں صدی میں اردو ناول
.7	فرمان فتح پوری	اردو نثر کا فنی ارتقا
.8	عشرت رحمانی	اردو ڈراما
.9	سنبل نگار	اردو نثر کا تنقیدی جائزہ

اکائی 26 : بیسویں صدی کے چند اہم تصنیفی اور تعلیمی ادارے

ساخت

26.1 تمہید
26.2 تعلیمی و تصنیفی اداروں کا مفہوم
26.3 بیسویں صدی کے چند اہم تصنیفی ادارے
26.4 انجمن ترقی اردو ہند
26.5 دارالمصنفین ،اعظم گڑھ، یو۔پی
26.6 دارالترجمہ، جامعہ عثمانیہ، حیدرآباد
26.7 قومی کونسل برائے فروغ اردو اور دیگر تصنیفی ادارے
26.8 بیسویں صدی کے چند اہم تعلیمی ادارے
26.9 خلاصہ
26.10 نمونہ امتحانی سوالات
26.11 فرہنگ
26.12 سفارش کردہ کتابیں

26.1 تمہید

دور حاضر میں ترسیل اور ابلاغ کے ذرائع کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔شعر و ادب کی ترسیل لازمی طور پر تصنیفی اور تعلیمی اداروں کی وساطت سے ہوتی ہے۔ استاد کی جانب سے شعر و ادب کی تفہیم کو تدریس کہا جاتا ہے جو تعلیمی اداروں میں ممکن ہے۔اس طرح کتابوں کی اشاعت کی وجہ سے قاری کو مطالعہ کا موقع دستیاب ہوتا ہے اور اس اشاعت کے عمل کو تصنیف کا درجہ دیا جاتا ہے۔ تعلیمی اور تصنیفی ادارے عہد حاضر میں تدریس اور مطالعے کی ضروریات پوری کرر ہے ہیں۔ تعلیمی اداروں کے ذریعہ زبان و ادب اور علوم وفنون کو سمجھنے اور سمجھانے کا مقصد پورا ہورہا ہے جب کہ تصنیفی اداروں کی جانب سے مختلف مضامین اور موضوعات اور کتابوں کی اشاعت سے علم وفن کے مطالعہ کے لیے سازگار ماحول پیدا ہورہا ہے۔اردو زبان و ادب کی ترقی اور ترویج میں تعلیمی اور تصنیفی اداروں مثلاً فورٹ سینٹ جارج کالج، فورٹ ولیم کالج اور دلی کالج وغیرہ کے قیام سے تعلیم کا رواج عام ہوا ہے۔ سرسید احمد خاں نے مدرستہ العلوم مسلمانان علی گڑھ قائم کرکے خانگی تعلیمی ادارے کی بنیاد رکھی اور سائنٹفک سوسائٹی کے توسط سے تعلیمی کارنامے انجام دینے کا سلسلہ شروع کیا۔اس طرح اردو میں تعلیمی و تصنیفی اداروں کا سلسلہ دراز ہوتا گیا چنانچہ بیسویں صدی میں کئی تعلیمی اور تصنیفی ادارے سرکاری، غیر سرکاری اور خانگی سطح پر اپنی کارکردگی کا مظاہرہ کرر ہے ہیں اور یہ ادارے اردو زبان و ادب کی ترقی و ترویج میں اہمیت کے حامل ہیں۔اس اکائی میں ایسے چند ہی اداروں کی تفصیلات پیش کی جائیں گی جو بیسویں صدی میں اردو زبان و ادب اور ثقافت کو پھیلانے کا وسیلہ بنے ہوئے ہیں۔

26.2 تعلیمی و تصنیفی اداروں کا مفہوم

ادارہ، انجمن، مجلس اور بزم جیسے الفاظ کا استعمال بیسویں صدی کی دین ہے۔ یہ الفاظ درحقیقت اجتماعیت کو ظاہر کرتے ہیں اور اجتماعیت کا

مفہوم بھی یہی ہے کہ کسی ایک مقصد کی تکمیل کے لیے کئی افراد ہم خیال ہو کر کام انجام دیں تو اس ہم خیالی کی وجہ سے کسی ادارے کا وجود ہوتا ہے۔ اگر اس ادارے کا کام تعلیم کا فروغ ہو تو اُسے تعلیمی ادارے کا درجہ دیا جائے گا اور اگر تصنیف و تالیف کی ترقی کی غرض سے ادارہ قائم ہو تو اسے تصنیفی ادارہ کہا جاتا ہے۔ ادارے کے قیام کے لیے عام طور پر کئی اشخاص کی ضرورت ہوتی ہے۔

تعلیمی و تصنیفی اداروں کا قیام سرکاری سطح پر بھی ہوسکتا ہے اور خانگی سطح پر بھی۔ حکومت کی امداد سے اور حکومت کے نامزد افراد کی وجہ سے کوئی ادارہ چلایا جائے تو اسے سرکاری تعلیمی و تصنیفی ادارے کا درجہ دیا جاتا ہے۔ آزادی کے بعد ہندوستان کی مختلف ریاستوں میں اردو اکاڈمیوں کا قیام اس بات کی دلیل ہے کہ اردو کی ترقی کے لیے حکومتی سطح پر سرکاری ادارہ اردو اکاڈمی کا قیام عمل میں لایا گیا جو سرکاری سطح پر عہدے دار کا انتخاب انجام دیتا ہے۔ جس کے ذمہ تعلیم و تصنیف دونوں شعبوں کی نگرانی ہوتی ہے۔ غیر سرکاری سطح پر کئی اشخاص آپسی رائے سے کوئی ادارہ قائم کریں تو اس کی کارکردگی کی بنیاد پر ایسے اداروں کو حکومتی امداد فراہم کی جاتی ہے۔

اس طرح تعلیمی اور تصنیفی ادارے سرکاری سطح پر بھی کام کرتے ہیں اور غیر سرکاری سطح پر بھی۔ اگر اداروں کی درجہ بندی کی جائے تو ان کی مختلف حیثیتیں ہوسکتی ہیں۔ حکومت کی جانب سے قائم کیے جانے والے اداروں کو سرکاری ادارے کہا جائے گا اور ایسے ادارے جن میں حکومت کسی قسم کی امداد دیتی ہے لیکن خانگی طور پر قائم کیا جائے تو اسے نیم سرکاری ادارے کا درجہ دیا جائے گا۔ اس کے علاوہ خانگی اور شخصی ادارے بھی قائم کیے جاتے ہیں۔ ایسے ادارے جو حکومت کی امداد کے بغیر آپسی امداد کے ذریعہ قائم کیے جائیں انہیں خانگی ادارے اور کسی شخص کے نام پر یا کسی ایک شخص کی جانب سے قائم کیے جانے والے ادارے کو شخصی ادارے کا درجہ دیا جاتا ہے۔ آزادی کے بعد ہندوستان میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کو سرکاری ادارے کا درجہ حاصل ہے۔ انجمن ترقی اردو ایک نیم سرکاری ادارہ ہے اس کے علاوہ سارے ہندوستان میں کئی خانگی اور شخصی ادارے قائم ہیں۔ ادارہ ادبیات اردو کو خانگی ادارے کا درجہ حاصل ہے جب کہ دہلی کی غالب اکاڈمی شخصی ادارے کا درجہ رکھتی ہے۔

تصنیفی اداروں کا تعارف

ہندوستان میں سرکاری سطح پر اور خانگی بنیادوں پر تصنیفی ادارے قائم کرنے کا سلسلہ کافی پرانا ہے۔ فورٹ ولیم کالج کے قیام اور فورٹ سینٹ جارج کالج کی شروعات کی وجہ سے سرکاری سرپرستی میں اٹھارویں صدی کے دوران کلکتہ اور مدراس میں تصنیفی اداروں کا آغاز ہوا۔ پھر اس کے بعد دلی کالج سے ہوتے ہوتے تصنیفی اداروں کی تاریخ علیگڑھ تحریک سے وابستہ ہوتی ہے۔ آزادی سے قبل تک ہندوستان میں لاتعداد شخصی، خانگی اور حکومت کی نگرانی میں کام کرنے والے تصنیفی ادارے موجود تھے۔ آزادی سے قبل مولانا شبلی نعمانی نے دارالمصنفین، اعظم گڑھ، یوپی کا ادارہ قائم کیا تھا۔ جس کا سلسلہ آج تک جاری ہے۔ حالی پبلشنگ ہاؤس کے نام سے ایک خانگی تصنیفی ادارہ قائم کیا گیا لیکن آزادی کے قبل ہی حکومت کی سرپرستی میں پبلیکیشن ڈویژن کا قیام عمل میں لایا گیا۔ ہندوستانی میں شائع ہونے والے ادبی رسالوں کے بذات خود تصنیفی ادارے موجود تھے۔ رسالہ ''دلگداز'' لکھنو، رسالہ ''نگار'' اور رسالہ ''ہمایوں'' کی جانب سے کتابیں شائع ہوتی تھیں۔ جو شخصی تصنیفی اداروں کی دلیل تھیں۔ خانگی تصنیفی اداروں میں انجمن ترقی اردو، حالی پبلشنگ ہاؤس، دارالمصنفین اور مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کے علاوہ سرسید بک ڈپو اہمیت کے حامل ہیں۔ اس طرح بیسویں صدی کے آغاز کے ساتھ ہی ہندوستان کی سرزمین میں کتابوں، رسالوں اور تحقیقی کارناموں کو پیش کرنے کے لیے مختلف تصنیفی اداروں کا سلسلہ شروع ہوا جس کی توسیع آج کے دور تک جاری ہے۔

تعلیمی اداروں کا تعارف

ہندوستان میں مغل دور تک فارسی کو سرکاری زبان کا درجہ حاصل رہا ہے۔ اس ملک پر انگریزوں کے قبضے کے بعد پہلی مرتبہ 1832ء میں ملک کی عدالتوں کی زبان اردو قرار دی گئی جس کے بعد ہندوستان کے مختلف خطوں میں اردو زبان کی ترقی و ترویج کے لیے تعلیمی اداروں کے ساتھ ساتھ تصنیفی اداروں کا سلسلہ بھی شروع ہوا۔ فورٹ ولیم کالج کلکتہ، فورٹ سینٹ جارج کالج مدراس اور دلی کالج کے بعد اگر کسی ادارے نے اردو تعلیمی

خدمات کو فروغ دینے میں حصہ لیا ہے تو وہ انجمن پنجاب ہے ۔ انجمن پنجاب نے پہلی مرتبہ اردو ذریعۂ تعلیم سے نصاب تیار کرنے اور اس نصاب کے مطابق کتابیں شائع کرنے کا اہتمام کیا۔ چنانچہ ادیب' ماہر' عالم' فاضل جیسے درجوں کے امتحانات کا سلسلہ شروع ہوا۔ جس کے بعد سرسید تحریک کے زیر اثر مدرسۃ العلوم مسلمانان علیگڑھ کا قیام عمل میں لایا گیا جو ترقی کرتے ہوئے مسلم اورینٹل کالج سے آگے بڑھ کر علیگڑھ مسلم یونیورسٹی جیسے بڑے تعلیمی ادارے میں تبدیل ہوگیا۔ شہر حیدرآباد میں اردو ذریعۂ تعلیم کو فروغ دینے کے لیے جامعاتی سطح پر آرٹس' سائنس اور کامرس کے علاوہ میڈیکل اور انجینئرنگ کی تعلیم کی سہولت اردو میں فراہم کرنے کے لیے جامعہ عثمانیہ کا قیام عمل میں لایا گیا اور اس جامعہ نے اردو ذریعہ تعلیم سے میڈیکل انجینئرنگ اور قانون کی تعلیم کو فروغ دینے کا سلسلہ شروع کیا۔ جامعہ عثمانیہ سے وابستہ دارالترجمہ نے کتابوں کی اشاعت کے لیے تصنیفی ادارے کی حیثیت سے اردو کتابیں شائع کرنے کی ذمہ داری قبول کی۔ اس طرح بیسویں صدی میں شہر حیدرآباد کے ذریعہ تعلیمی اداروں کا ایک سلسلہ شروع ہوا جس کی طویل تاریخ' ریاست حیدرآباد کے سربراہ میر عثمان علی خاں آصف سابع کی کارکردگی کی داد دیتی ہے۔

تعلیمی و تصنیفی اداروں کے مشترکہ کارنامے

بیسویں صدی میں اردو کے تعلیمی اور تصنیفی اداروں نے اہم کارنامے انجام دیے۔ کچھ ادارے تو ایسے تھے جنہوں نے صرف تعلیم کا حق ادا کیا جب کہ بے شمار اداروں نے صرف تصنیف کی طرف توجہ دی۔ جبکہ کئی ادارے ایسے تھے جنہوں نے تعلیم اور تصنیف کی طرف خصوصی توجہ دی۔ بیسویں صدی میں دارالمصنفین اعظم گڑھ' یوپی ایک ایسا ادارہ ہے جس نے معرکۃ الاراء تاریخی اور اسلامی کتابوں کی اشاعت کی ذمہ داری پوری کی جب کہ انجمن ترقی اردو نے اورنگ آباد منتقلی کے بعد اردو ذریعۂ تعلیم کی تحریک بھی چلائی اور تصنیفی ضروریات کی تکمیل بھی کی۔ چنانچہ انجمن ترقی اردو اورنگ آباد نے تعلیمی ضروریات کی تکمیل کے لیے اول تا دسویں جماعت تک کی نصابی کتابوں کی اشاعت کا کام انجام دیا جب کہ بے شمار علمی کتابوں کی اشاعت کا سلسلہ بھی جاری رکھا جو اس بات کا ثبوت ہے کہ بیسویں صدی کی ابتدائی تین دہائیوں کے دوران ہندوستان میں اردو کے کئی ایسے اہم ادارے قائم ہوگئے تھے جو اردو ذریعہ تعلیم کے فروغ اور اردو کتابیں شائع کرنے کی خدمت پر مامور تھے جن کے ذریعہ تصنیف و تالیف اور تعلیم کے کام انجام دیے جاتے رہے۔

اپنی معلومات کی جانچ

1. تصنیفی ادارے سے کیا مراد ہے؟
2. اردو ذریعۂ تعلیم کا آغاز کب ہوا؟
3. چند تصنیفی اداروں کے نام بتائیے؟
4. سرسید نے کون سا مدرسہ قائم کیا تھا؟
5. جامعاتی سطح کی اردو تعلیم کہاں شروع کی گئی؟

26.3 بیسویں صدی کے چند اہم تصنیفی ادارے

آزادی کے قبل تک ہندوستان کو برصغیر کا درجہ حاصل تھا اور یہ ملک تہذیب اور تمدن علم و ادب کی وجہ سے عالمی شہرت کا حامل رہا۔ چوں کہ سرکاری زبان کی حیثیت سے اردو کو فروغ حاصل ہو رہا تھا۔ اس لیے سارے ملک میں تصنیفی مراکز اور ادارے موجود تھے جو خوبصورت اور پُر از معلومات کتابیں شائع کر کے اردو کی شان میں اضافہ کر رہے تھے۔ ایسے اداروں میں تاج کمپنی لاہور کو سب سے زیادہ مقبولیت حاصل تھی۔ تصنیف کو فروغ دینے کے لیے مختلف مطبع قائم کیے گئے تھے۔ جہاں کتابوں کی اشاعت کا کام انجام دیا جاتا تھا۔ مطبع نولکشور کا سلسلہ انیسویں صدی عیسوی میں شروع ہو کر بیسویں صدی تک جاری رہا۔ اگر بیسویں صدی کے تصنیفی اداروں کی درجہ بندی کی جائے تو یہ اندازہ ہوتا ہے کہ بعض تصنیفی

ادارے صرف چھاپہ مشینوں کی حد تک محدد تھے جہاں صرف کتابیں شائع ہوتی تھیں اور بعض تصنیفی اداروں میں کتابیں ترجمہ کرنے کا عمل بھی جاری تھا۔ جب کہ بے شمار تصنیفی ادارے ایسے تھے جو ادب تہذیب و ثقافت کو فروغ دینے کا کام انجام دے رہے تھے۔ ایسے اداروں میں سب سے اہم نام دارالمصنفین اعظم گڑھ کا تھا۔ جس کے بعد انجمن ترقی اردو نے تصنیف و تالیف کی دنیا میں نام کمایا' پھر دارالترجمہ جامعہ عثمانیہ کی ملک گیر شہرت ہوئی۔ اس کے علاوہ کئی خانگی تصنیفی ادارے جیسے حالی بک ڈپو' اعجاز پبلشنگ ہاؤس' مکتبہ جامعہ لمیٹڈ' فروغ اردو جیسے اداروں نے صرف تصنیفی خدمات کو اپنے ذمہ لے کر اردو کے فروغ میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ آج کے دور میں حکومت کی جانب سے پبلیکیشن ڈویژن اور ہر ریاست میں حکومت کی جانب سے قائم کردہ ٹکسٹ بک بیورو کا قیام اور ان کے ذریعہ ہر ریاست کی تعلیمی ضروریات کے مطابق شائع ہونے والی نصابی کتابیں خود اس بات کی دلیل ہیں کہ بیسویں صدی میں تصنیفی اداروں کا احاطہ کافی وسیع ہوگیا ہے اور ہر بڑے شہر میں اشاعتی ادارے قائم ہیں۔ تصنیفی خدمات انجام دینے میں اردو کے اہم رسالوں نے بھی اپنی خدمات انجام دیں۔ ماہنامہ ''نگار'' کا اپنا پبلشنگ ہاؤس تھا۔ رسالہ شمع کا بذات خود شمع بک ڈپو اور اس طرح بیسویں صدی پبلشنگ ہاؤس' تجلی بک ڈپو اور ندوۃ العلما نے بیسویں صدی میں تصنیف و تالیف کی خدمات انجام دیں۔ سب سے زیادہ تصنیفی خدمات انجمن ترقی اردو اور دارالترجمہ جامعہ عثمانیہ حیدرآباد' ادارہ ادبیات اردو' حالی پبلشنگ ہاؤس' مکتبہ جامعہ لمیٹڈ' فروغ اردو لکھنو' سرسید بک ڈپو کے ذریعہ انجام دی گئیں اور یہ ادارے آج بھی اردو کتابوں کی اشاعت کے ذریعہ تصنیفی خدمات انجام دے رہے ہیں۔

26.4 انجمن ترقی اردو ہند

انجمن ترقی اردو علیگڑھ مسلم یونیورسٹی کا ایک ادارہ تھا جس کو مولوی عبدالحق نے علیگڑھ سے الگ کر کے ایک مکمل ادارہ کی حیثیت سے حیدرآباد پھر شہر اورنگ آباد میں منتقل کیا۔ ہندوستان کی آزادی کے بعد اس انجمن کے دو حصے ہوگئے۔ ہندوستان میں انجمن ترقی اردو ہند اور پاکستان میں انجمن ترقی اردو پاکستان کا وجود رہا۔ مولوی عبدالحق کی نگرانی کی وجہ سے انجمن ترقی اردو کو فروغ حاصل ہوا۔ سب سے پہلے انجمن نے اردو ادبیات کی قدیم کتابیں مرتب کر کے شائع کرنی شروع کیں جس کی وجہ سے اس انجمن کی شہرت ہوئی پھر حکومت حیدرآباد کی جانب سے انجمن ترقی اردو کو نصابی کتابوں کی اشاعت کے لیے امداد دی گئی اور اردو انگریزی ڈکشنری تیار کرنے کے لیے بھی حیدرآباد کے بادشاہ آصف سابع میر عثمان علی خاں نے امداد کا اعلان کیا۔ اس طرح انجمن ترقی اردو کی خدمات سے ایک بہت بڑا انقلاب آیا اور اس ادارے کی کتابیں سارے ملک میں قدر کی نگاہ سے دیکھی جانے لگیں۔ کتابوں کی اشاعت کے لیے مولوی عبدالحق نے اورنگ آباد میں اس انجمن کا مطبع قائم کیا جس کی وجہ سے کتابوں کی اشاعت میں تیزی پیدا ہوئی۔ انجمن ترقی اردو کی بے شمار شاخیں ملک کے شہروں میں قائم ہوئیں۔ جس کا صدر مقام اورنگ آباد تھا۔ انجمن کی شاخوں کی وجہ سے اس کی کتابوں کی نکاسی کے لیے سہولت حاصل ہوئی۔

انجمن ترقی اردو کے تصنیفی کارنامے

اورنگ آباد میں انجمن ترقی اردو کی منتقلی کے بعد اس ادارے کی کارکردگی میں کئی گنا اضافہ ہوگیا۔ مولوی عبدالحق نے اعزازی ارکان' ہمہ وقتی ارکان اور مشاورتی ارکان کی ترتیب کے ذریعے انجمن کی ترقی کے لیے کام کیا اور اس کی شاخیں سارے ملک میں قائم ہونے لگیں۔ انجمن ترقی اردو سے وابستگی کے بعد مولوی عبدالحق نے اس ادارے کے ذریعے جو تصنیفی کارنامے انجام دیے انہیں چار مختلف گروہوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ سب سے پہلے انہوں نے پرانے تذکروں اور نایاب کتابوں کی ترتیب و اشاعت کا سلسلہ شروع کیا جس کے ذریعے نکات الشعرا' عقد ثریا اور ایسے ہی بے شمار تذکرے شائع ہوئے۔ انجمن ترقی اردو کی تصنیفی خدمات میں دوسرا طریقہ تحقیق سے متعلق تھا۔ مولوی عبدالحق نے تحقیق پر توجہ دی اور تحقیقی کام کرنے والوں کی کتابوں کو شائع کرنے کا منصوبہ بنایا جس کی وجہ سے مشہور کتابیں مثلاً سب رس' نصرتی اور معراج العاشقین وغیرہ' ادارے کی جانب سے شائع ہوئیں۔ انجمن ترقی اردو کی تصنیفی خدمات میں تیسرا مرحلہ نصابی کتابوں کی اشاعت کا تھا۔ مولوی عبدالحق نے ریاست حیدرآباد کے تعلیمی نصاب کی کتابیں شائع کر کے اس تصنیفی ادارے کو فروغ دیا اور انجمن ترقی اردو کا چوتھا اور آخری کارنامہ یہ ہے کہ مولوی عبدالحق نے

اصطلاحات کی اشاعت اور انگریزی اور اردو لغت کی ترتیب کا کام انجام دیا۔ اس طرح اس ادارے کے ذریعہ مختلف تصنیفی کارنامے انجام دیے گئے۔

انجمن کی مطبوعہ نصابی کتابیں

انجمن ترقی اردو نے پہلی مرتبہ 'درس آصفیہ' کے زیر عنوان اردو کے قاعدے کو چھوڑ کر پہلی سے لے کر نویں جماعت تک کی نصابی کتابیں شائع کیں۔ یہ نصابی کتابیں تدریجی ارتقا کی علمبردار تھیں۔ ہر کتاب کے پیش لفظ میں مولوی عبدالحق نے خود یہ لکھا ہے کہ سابق کتاب میں کس قدر الفاظ طلبا کو سکھائے گئے اور نئی کتاب علم کے اضافے کے ساتھ ساتھ کس قدر نئے الفاظ سکھانے کا وسیلہ بنتی ہے۔ ان نصابی کتابوں کی کتابت و طباعت منفرد تھی۔ مولوی عبدالحق نے چھوٹی جماعتوں کی نصابی کتابیں ترتیب دینے کے لیے بھوپال سے کاتبین کو مقرر کیا تھا تا کہ وہ نمایاں اور واضح الفاظ کے ذریعہ کتاب ترتیب دیں جس سے کہ طلبا کو پڑھنے میں آسانی ہو یعنی مولوی عبدالحق نے بچوں کے مزاج' ان کی نفسیاتی ضرورتوں کا لحاظ رکھتے ہوئے یہ نصابی کتابیں ترتیب دیں جسے انجمن ترقی اردو اورنگ آباد کا ایک اہم کارنامہ قرار دیا جاتا ہے۔

انجمن کی مطبوعہ تحقیقی وتنقیدی کتابیں

انجمن ترقی اردو کے قیام کے طویل عرصہ بعد تک بھی تحقیق کے فن پر اردو میں کوئی مبسوط کتاب موجود نہیں تھی۔ خود مولوی عبدالحق نے اپنے ذوق کی تکمیل کے نتیجہ میں تحقیق کے فن کو اختیار کیا تھا۔ انہوں نے تحقیقی کتابیں شائع کرنے کے لیے انجمن ترقی اردو کو ایک وسیلہ کے طور پر استعمال کیا۔ ایک جانب قدیم شعرا کا کلام محفوظ کرنا اور ان کے کلام کے محاسن کو نمایاں کرنا مولوی عبدالحق کے پیش نظر رہا جس کے نتیجہ میں ترتیب کے ذریعہ تحقیق کا حق ادا کیا گیا۔ مولوی عبدالحق کی مرتبہ کتابیں ''انتخاب کلام میر'' اور مرحوم دہلی کالج تحقیقی وتنقیدی ژرف نگاہی کی علامت بن گئی ہیں۔ کافی تحقیق کے بعد مولوی عبدالحق نے اردو کے قدیم تذکرے مرتب کر کے شائع کیے۔ ان کا یہ کارنامہ اہمیت کا حامل ہے۔ مولوی عبدالحق نے شخصی تحقیق کی بنیاد رکھتے ہوئے انجمن ترقی اردو سے نصرتی' سب رس جیسی کتابیں شائع کیں جو تحقیق کے میدان میں بڑی اہمیت کی حامل کتابیں سمجھی جاتی ہیں۔ مولوی عبدالحق کی تحقیقی خدمات پر طویل مقالے لکھے جا چکے ہیں۔ اس موقع پر صرف ان کی کارکردگی کا اظہار مقصود ہے۔

انجمن کی مطبوعہ علوم وفنون کی کتابیں

انجمن ترقی اردو کے قیام کا ایک اہم مقصد یہ بھی تھا کہ صرف شعر وشاعری کو فروغ دینے کو مقصد نہ بنایا جائے بلکہ شعر وادب کے ساتھ علوم وفنون کے فروغ پر بھی توجہ دی جائے۔ چنانچہ مولوی عبدالحق نے فنون کی ترقی کے لیے سب سے پہلے کتاب اصطلاحات پیشہ وران کئی جلدوں میں شائع کی۔ سائنسی شعور کو عام طور پر فروغ دینے کے لیے انجمن کی جانب سے رسالہ ''سائنس'' جاری کیا۔ ادب کے علاوہ تاریخ فلسفہ' نفسیات' اسلامیات اور دیگر شعبہ جات سے متعلق کتابیں شائع کرنے پر توجہ دی جس کے لیے کئی مترجمین کا تقرر عمل میں آیا۔ عبدالحق نے علوم وفنون کی کتابیں شائع کرنے کا تجربہ سرسید سے حاصل کیا تھا۔ چونکہ ان کے دور میں دارالترجمہ جامعہ عثمانیہ کے ذریعہ علوم وفنون پر نصابی کتابیں شائع ہو رہی تھیں۔ اس لیے عبدالحق نے علوم وفنون کے ایسے گوشوں کو انجمن کے لیے مختص کیا جن کا تعلق خاص فن سے تھا جس کے نتیجہ میں اصلاحات پیشہ وروں جیسی کتابیں ہی نہیں بلکہ خود مولوی وحیدالدین سلیم کی کتاب ''وضع اصلاحات بھی'' انجمن ترقی اردو سے شائع ہوئی۔

اپنی معلومات کی جانچ

1. اردو کا پہلا تصنیفی ادارہ کون سا ہے؟
2. انجمن ترقی اردو کی مطبوعہ نصابی کتابیں کون سی ہیں؟
3. انجمن نے کون سی تحقیقی کتابیں شائع کی ہیں؟
4. علوم وفنون پر انجمن ترقی اردو کی چند کتابوں کے نام بتایئے۔

26.5 دارالمصنفین اعظم گڑھ یوپی

اسلامیات اور اسلامی علوم کی تحقیق و ترویج کے علاوہ ان علوم وفنون کو اردو میں متعارف کروانے کے لیے علامہ شبلی نعمانی کی تحریک پر قائم کردہ دارالمصنفین اعظم گڑھ کو ایک تصنیفی ادارے کا درجہ حاصل ہے جہاں تحقیق' تصنیف' تالیف' ترتیب اور تلخیص کا کام انجام دیا جاتا ہے۔ اسی ادارے سے مشہور زمانہ رسالہ ''معارف'' کا اجرا عمل میں لایا گیا۔ جو برسوں سے آج تک جاری ہے۔ دارالمصنفین نے تحقیق کو اپنا بنیادی پیشہ بنایا جس کی وجہ سے اس ادارے کی بیشتر کتابیں تحقیق و تلخیص سے متعلق ہوتی ہیں۔ یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ دارالمصنفین نے اپنی تصنیف و تالیف کے ذریعہ ٹھوس تحقیق کی بنیاد رکھی ہے۔ اس ادارے نے مشرقی ادبیات' مشرقی شعریات اسلام اور اسلامی علوم' اسلامی تاریخ اور فنون پر سلسلہ وار کتابیں شائع کر کے سارے ہندوستان میں ان کی پذیرائی کا سلسلہ جاری رکھا۔ دارالمصنفین کی تصانیف میں عربی' فارسی اور انگریزی زبان سے استفادہ کا رجحان بکثرت دکھائی دیتا ہے۔ اس ادارے سے وابستہ افراد میں سید سلیمان ندوی' عبدالسلام ندوی' صباح الدین' عبدالرحمٰن جیسے محققین قابل ذکر ہیں۔ جنہوں نے ٹھوس تحقیق کے ذریعہ مشرقی علوم وفنون کی ترقی و ترویج میں حصہ لینے کے لیے اپنی نادر و نایاب کتابوں کا اضافہ کیا۔

دارالمصنفین کی مطبوعہ تصانیف

اعظم گڑھ میں قائم اس ادارے نے افسانوی اور غیر افسانوی ادب کے علاوہ تحقیق پر توجہ دی اور تحقیقی کتابیں پیش کرنے کا سلسلہ شروع کیا جس کی وجہ سے خاص کتابت اور طباعت کے ذریعہ دارالمصنفین کی کتابیں شائع ہونے لگیں اور ان کتابوں کی طویل فہرست ہے جن کا تعلق اسلام کی عظمت رفتہ اور اسلامی علوم وفنون سے ہے۔ اس ادارے سے وابستہ قلمکاروں کی فہرست بھی کافی طویل ہے اور یہ بات وثوق کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ تحقیقی ذہن رکھنے والا تخلیق کار ہی دارالمصنفین سے وابستگی رکھ سکتا ہے جس کا ذہن اسلام اور اسلامیات سے فطری طور پر وابستہ ہو۔ غرض بے شمار محققین نے دارالمصنفین کے ذریعہ اپنی عمدہ تحریروں کے نمونے پیش کیے۔

دارالمصنفین کی تاریخ اسلام اور ہند پر تصانیف

دارالمصنفین اعظم گڑھ کا یہ کارنامہ رہا ہے کہ اس نے تاریخ اسلام اور ہندوستان میں مسلمانوں کے اقتدار پر کیے جانے والے اعتراضات کے جوابات کے بجائے تاریخی پس منظر میں حقائق کو پیش کرنے کے لیے تاریخی سیریز کا سلسلہ شروع کیا جس کے تحت اسلام' صحابہ اور صحابیات' امہات المومنین' مسلمان مورخین اور اسلامی علوم جیسے تفسیر' فقہ' حدیث اور اجتہاد پر دارالمصنفین کی کئی کتابیں شائع ہوئیں جن کی فہرست معارف کے شماروں میں شائع ہوتی رہتی ہے۔ تاریخ اسلام کے اس تعارف کے ساتھ ساتھ دارالمصنفین نے ہندوستانی تاریخ لکھنے پر بھی توجہ دی۔ چنانچہ ہندوستان میں مسلمانوں کے اقتدار پر لاتعداد کتابیں شائع ہوئیں۔ علامہ عبدالسلام ندوی اور صباح الدین عبدالرحمٰن کی بے مثل تحقیقی کتابیں ہندوستانی تاریخ سے متعلق ہیں اور ہندوستان میں فن تعمیر' فنِ موسیقی اور فنِ تقریر کو فروغ دینے والے مسلمانوں کی تاریخی حقیقت و اہمیت کو بھی دارالمصنفین نے نمایاں کیا۔

دارالمصنفین کی عام مطبوعات

تحقیق کو بنیاد بنا کر دارالمصنفین میں تاریخ' تاریخ اسلام' اصول تاریخ اور تاریخ ہند' فقہ و عقائد' تفسیر اور تعلیم و تربیت کے علاوہ دارالمصنفین میں ایسی کتابیں بھی لکھی گئیں جن کا تعلق عام موضوعات سے ہے۔ ''اسلام میں رواداری'' دارالمصنفین کی ایک ایسی کتاب ہے۔ اسلامی شخصیات اور اہم کارنامے انجام دینے والے مصنفین پر شائع ہونے والی کتابیں بھی دارالمصنفین کی عام مطبوعات میں شامل ہیں۔ اس ادارے نے ادبی ذوق وشوق سے متعلق علوم پر کتابیں نہیں شائع کیں بلکہ ٹھوس حقائق سے وابستہ علوم وفنون کو فروغ دینے کے لیے کتابوں کی اشاعت کا سلسلہ جاری رکھا اور یہ ادارہ اب بھی اپنی خدمات انجام دے رہا ہے۔

اپنی معلومات کی جانچ

1. دارالمصنفین کہاں واقع ہے اور اسے کس نے شروع کیا؟
2. دارالمصنفین نے کس قسم کی کتابیں شائع کیں؟
3. دارالمصنفین کے رسالہ کا نام بتایئے؟
4. درالمصنفین کی مطبوعات کون کون سے فن پر ہیں؟

26.6 دارالترجمہ عثمانیہ یونیورسٹی

ریاست حیدرآباد کی تعلیمی ترقی کے لیے آصف سابع میر عثمان علی خان نے اپنے ایک فرمان کے ذریعے اردو ذریعۂ تعلیم کی ایک یونیورسٹی کے قیام کا اعلان کیا۔ اس یونیورسٹی کی نصابی کتابوں کی اردو میں اشاعت کے لیے دارالترجمہ جامعہ عثمانیہ کا قیام عمل میں لایا گیا۔ 1912ء کے فرمان کے ذریعہ دارالترجمہ کے قیام کا اعلان کیا گیا جس میں سائنس' انجینئرنگ' میڈیسن' قانون اور علوم عمرانیات کی کتابیں انگریزی زبان سے اردو میں ترجمہ کرکے شائع کرنے کا منصوبہ بنایا گیا۔ اس محکمہ کو آزادانہ طور پر کام کرنے کی سہولت فراہم کی گئی۔ چنانچہ محکمہ کا سربراہ ناظم کی حیثیت سے کام کرتا جو مختلف علوم وفنون کے مترجمین کے تقرر کا مجاز تھا۔ دارالترجمہ سے وابستہ تمام ملازمین کی تنخواہ اور جز وقتی ملازمین کی یافت کی ذمہ داری حکومت کے سپرد تھی۔ ملک کے کونے کونے سے قابل اور ماہر اساتذہ کا دارالترجمہ میں تقرر کیا گیا جنہوں نے مختلف علوم وفنون کی کتابوں کا ترجمہ کرکے خوبصورت طباعت اور جلد سازی کے ذریعہ کتابیں پیش کیں۔ دارالترجمہ کی کتابیں اس لیے اہمیت کی حامل ہیں کہ علوم وفنون کی یہ کتابیں ملک بھر میں پہلی مرتبہ سرکاری سرپرستی میں شائع ہورہی تھیں۔ اس ادارے سے (7) ناظم اور (129) مترجمین وابستہ رہے جنہوں نے مختلف علوم وفنون کی (386) کتابیں ترجمہ کرکے شائع کیں۔ ریاست کی سرکاری زبان اردو تھی اور جامعہ عثمانیہ میں انٹرمیڈیٹ سے لے کر ایم۔اے کی سطح تک اور میڈیکل' انجینئرنگ' قانون اور سائنسی علوم کی تعلیم اردو میں دی جاتی تھی۔ اور اسی زبان میں نصاب کی تکمیل کے لیے دارالترجمہ نے اردو میں کتابیں ترجمہ کیں جن کی اشاعت دارالطبع سرکار عالی کے ذریعہ عمل میں لائی جاتی تھی۔ پولیس ایکشن کے بعد جامعہ عثمانیہ کے اردو ذریعہ تعلیم کا خاتمہ ہوگیا۔ چنانچہ اردو نصابی کتب کی ضرورت باقی نہ رہی۔ دارالترجمہ کے ملازمین کو دوسرے شعبہ جات میں ضم کردیا گیا اور 18 دسمبر 1952ء کی رات کو دارالترجمہ کے ذخیرے میں آگ لگنے کی وجہ سے نادر ونایاب کتابیں جل کر خاکستر ہوگئیں۔ اس طرح 1917ء سے لیکر 1950ء تک اردو میں کتابوں کی اشاعت کا سلسلہ جاری رہا۔ اسی لیے دارالترجمہ کی ساری کارکردگی کو 33 سالہ خدمات سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ سائنسی علوم اور علوم عمرانیات کے علاوہ طب' قانون اور انجینئرنگ پر دارالترجمہ کی جانب سے شائع شدہ نادر ونایاب کتابیں آج بھی مختلف کتب خانوں میں اپنے دور کی داستان سناتی ہیں۔

دارالترجمہ کے مترجمین اور تراجم

چونکہ جدید علوم وفنون پر انگریزی میں بے حساب کتابیں دستیاب تھیں اور ملک میں پہلی مرتبہ ایک ملکی زبان کو تعلیمی سطح پر رائج کرنے کا تجربہ جامعہ عثمانیہ میں کیا گیا تھا۔ اس لیے اردو نصابی کتابوں کی اشاعت کے لیے دارالترجمہ میں تین قسم کے مترجمین کا تقرر عمل میں آیا۔ (1) ہمہ وقتی مترجمین (2) جز وقتی مترجمین اور (3) وقتی مترجمین۔ جن کے ذمہ یہ کام ہوتا تھا کہ متعلقہ مضمون کی نصابی کمیٹی جس کتاب کی سفارش کرلے اور اس کا اردو ترجمہ کرکے پیش کیا جائے۔ ترجمہ شدہ مسودوں پر ناظر ادبی اور مذہبی کی رائے طلب کی جاتی اور مترجم کو یہ تاکید کی جاتی تھی کہ کوئی نئی اصطلاح کتاب میں شامل ہو تو اس اصطلاح اور اس کے متبادل ترجمہ کو حاشیہ پر لکھ دیا جائے تاکہ اس اصطلاح کے بارے میں اصطلاحات کمیٹی غور کرسکے۔ ناظر ادبی اور ناظر مذہبی کتاب کے ترجمہ کے بعد اس میں کسی قسم کی مذہبی اور ادبی بے ضابطگی کے باضابطہ ذمہ دار تھے۔ مترجمین کا کام یہی ہوتا تھا کہ وہ ترجمہ شدہ مسودہ ناظم کے حوالے کردیں۔ دارالترجمہ سے وابستہ مترجمین کی طویل فہرست ہے جن میں عبداللہ عمادی' سید ہاشمی

فرید آبادی، عبدالماجد دریابادی، عبدالحلیم شرر، مرزا محمد ہادی رسوا اور جوش ملیح آبادی وغیرہ کے نام لیے جاسکتے ہیں جنھوں نے علوم عمرانیات، سائنسی علوم، میڈیکل، انجینئرنگ اور قانون کی کتابیں شائع کر کے دارالترجمہ کے معیار و مرتبہ کو بلند کیا۔

دارالترجمہ اور علوم وفنون کی خدمات

جامعہ عثمانیہ میں جن علوم وفنون کی تعلیم و تدریس کا انتظام تھا ان کی تمام کتابیں دارالترجمہ سے اردو میں شائع کی جاتی رہیں۔ اس زمانے میں انٹرمیڈیٹ اور گریجویشن کی تعلیم کی اہمیت تھی۔ اس لیے آرٹس، سائنس، کامرس، انٹرمیڈیٹ اور اس طرح آرٹس اور سائنس، گریجویشن، قانون کے علاوہ میڈیکل اور انجینئرنگ کی بے شمار معیاری کتابوں کا اردو میں ترجمہ کیا گیا۔ یہ کتابیں درحقیقت دارالترجمہ کے ذریعہ شائع ہوئیں لیکن ان کی حیثیت جامعہ عثمانیہ کے نصاب کی تھی۔ یورپ کی مشہور یونیورسٹیاں جیسے آکسفورڈ اور کیمبرج یونیورسٹی وغیرہ کے نصاب کو سامنے رکھ کر جامعہ عثمانیہ کے مختلف شعبہ جات کے بورڈ آف اسٹڈیز کے ذمہ داروں نے جس کتاب کو معیاری نصاب کا درجہ دیا اسے مترجم کے حوالے کیا جاتا اور ترجمے کے لیے وقت مقرر کردیا جاتا تھا تاکہ وہ مناسب وقت میں ترجمہ پیش کرسکے۔ اس طرح دارالترجمہ میں علوم وفنون کی کتابیں بھی ترجمہ کی گئیں۔

دارالترجمہ میں وضع اصطلاحات

کسی علم سے متعلق ایک زبان میں موجود لفظ کے لیے دوسری زبان میں نیا لفظ وضع کرنے کو اصطلاح وضع کرنا کہتے ہیں۔ دارالترجمہ کے ذریعہ انجینئرنگ، میڈیسن، قانون، سائنس اور علوم عمرانیات کی ایک لاکھ سے زیادہ اصطلاحات تیار کی گئیں۔ مترجم پر یہ ذمہ داری عائد کی گئی تھی کہ کوئی بھی نیا لفظ ترجمہ کے دوران محسوس کیا جائے اور اس کا متبادل اردو میں نہ ہو تو اس انگریزی لفظ کا معنی اور اس کی مختصر تفصیل حاشیہ میں درج کردی جائے۔ ایسے الفاظ کی فہرست تیار کر کے ایک کمیٹی کے سپرد کیا جاتا۔ اس کمیٹی کو دارالترجمہ کی وضع اصطلاحات کمیٹی کا نام دیا گیا تھا۔ اس کمیٹی نے عینت، تپش پیما، بادپیما، حیہ اور مائع جیسی نئی اصطلاحات اردو زبان کو دیں۔ ہر علم وفن کی اصطلاحات کو حروف تہجی سے ترتیب دے کر اس کی کتابیں تیار کی جاتی تھیں اور کتاب کے آخر میں ان اصطلاحات کا اندراج ہوتا تھا۔ کتابی شکل میں اصطلاحاتِ طب، اصطلاحاتِ کیمیا، اصطلاحاتِ فلسفہ جیسی کتابیں دارالترجمہ سے شائع ہوچکی ہیں۔ دارالترجمہ کی جانب سے اصطلاحاتِ علمیہ، اعلام و اسما اور ترقیمات کے مترادفات اردو میں تیار کیے گئے اور دارالترجمہ کی 32 سالہ کارکردگی میں ان کی تعداد (91,000) تصور کی جاتی ہے۔ ایک اندازے کے مطابق (12) سب کمیٹیوں نے (32) علوم وفنون کی نئی اصطلاحات مرتب کر کے اردو الفاظ کے ذخیرے میں نیا اضافہ کیا۔

اپنی معلومات کی جانچ

1. دارالترجمہ کب قائم ہوا؟
2. علوم وفنون کی دارالترجمہ نے کس طرح خدمت کی؟
3. دارالترجمہ کی اصطلاحات کے بارے میں آپ کیا جانتے ہیں؟
4. دارالترجمہ کی چند مترجمین کے نام بتائیے۔
5. دارالترجمہ کیسے ختم ہوا؟

26.7 کونسل برائے فروغ اردو نئی دہلی

ہندوستان کی آزادی کے بعد اردو کی ترقی اور اس زبان میں علوم وفنون پر شعر و ادب کی کتابوں کی اشاعت کے لیے حکومتی اعلامیہ کے ذریعہ ایک ادارے کا قیام عمل میں لایا گیا اور اس کا نام ''ترقی اردو بیورو'' رکھا گیا جس کے ذمہ نایاب اردو کتابیں شائع کرنا، تحقیقی کتابوں کی اشاعت اور علوم وفنون پر شائع ہونے والی انگریزی کتابوں کے ترجمہ کے علاوہ تاریخ، ثقافت، بچوں کا ادب جیسے موضوعات پر ادیبوں سے کتابیں

طلب کر کے اس کی اشاعت کی ذمہ داری قبول کرنا ہے۔ اس ادارے نے علم و ادب کی بے شمار کتابیں شائع کیں۔ طویل عرصہ بعد اس کے نام میں تبدیلی لائی گئی اور دور حاضر میں اس کا نام ''قومی کونسل برائے فروغ اردو'' رکھا گیا۔ مختلف علوم وفنون پر اس ادارے کی جانب سے 500 سے زیادہ کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ اس ادارے کی حیثیت آزادانہ ہے اور ادارے کی کارکردگی کو فعل اور مستحکم رکھنے کے لیے مختلف عہدوں پر تقررات عمل میں لائے جاتے ہیں اور اس ادارے کی کارکردگی کو نمایاں کرنے کے لیے عوامی نمائندے بھی منتخب کیے جاتے ہیں۔ اس ادارے کی شائع شدہ کتابوں کو ملک کے کونے کونے میں پھیلانے کے لیے پبلیکیشن ڈویژن جیسا حکومتی ادارہ اس کی مدد کرتا ہے اور خود کونسل کے مختلف مراکز شمالی ہند اور جنوبی ہند میں موجود ہیں۔ آندھرا پردیش کی نصابی کتابوں کو اردو میں ترجمہ کرا کے ان کی اشاعت کی ذمہ داری بھی کونسل نے قبول کی ہے اور یہ سلسلہ اب بھی جاری ہے۔

حالی بک ڈپو

آزادی سے قبل اردو دنیا میں کتابوں کی اشاعت کے لیے حالی بک ڈپو کو غیر معمولی شہرت حاصل تھی۔ اردو کا یہ واحد ادارہ تھا جو اردو کتب کی اشاعت کی ذمہ داری انجام دیا کرتا تھا۔ اس ادارے نے ابتدا سے لے کر 1926ء تک اردو کے تمام نثر نگار، شاعر، مورخ، مفسر، سوانح نگار اور دوسرے علوم وفنون کی نمائندگی کرنے والے قلمکاروں کی ایک جامع کتاب ''مصنفین اردو'' شائع کی تھی جس میں حروف تہجی کے اعتبار سے ہر فن کے بہترین ادیبوں کی سوانح اور ان کی تمام کتابوں کا تعارف موجود تھا۔ مولانا حالی کے نام سے قائم کردہ اس بک ڈپو نے صرف حالی کی کتابیں ہی نہیں بلکہ بے شمار عملی و ادبی کتابیں شائع کر کے انہیں اردو دنیا میں شہرت دلائی۔ اردو کے قدیم تصنیفی اداروں میں حالی بک ڈپو کے اشاعتی کارناموں کی بڑی اہمیت ہے۔

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ

جامعہ ملیہ اسلامیہ کی نمائندگی کرنے والے اس ادارے نے سب سے پہلے جامعہ کی نصابی کتابیں اردو میں شائع کرنے کی طرف توجہ دی لیکن پھر رفتہ رفتہ اس ادارے نے مختلف علوم وفنون کی کئی کتابیں شائع کرنے کی ذمہ داری قبول کی۔ اس ادارے کے کاروبار میں جب خاطر خواہ اضافہ ہوا تو مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی کی مختلف شاخیں قائم ہوئیں، چنانچہ آج بھی علیگڑھ اور ممبئی میں اس کی شاخیں موجود ہیں جو کتابوں کی نکاسی کا کام انجام دے رہی ہیں۔ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نے بچوں کے لیے ایک رسالہ ماہنامہ پیام تعلیم اور اردو ادب کی صورت حال کو نمایاں کرنے کے لیے کتاب نما شائع کرنا شروع کیا۔ ابتدا میں کتاب نما کی حیثیت کتابوں کی فہرست اور اہم کتابوں پر تبصرے شائع کرنے کی حد تک محدود تھی لیکن دور حاضر میں ''کتاب نما'' ایک ادبی رسالہ کا درجہ حاصل کر چکا ہے۔ بچوں کے ادب پر مکتبہ کی خوبصورت اور بے شمار کتابیں شائع ہو چکی ہیں اور سب سے پہلے خوبصورت نصابی کتابیں شائع کرنے کا سلسلہ بھی مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نے شروع کیا اور اس ادارے کی شائع شدہ نصابی کتابیں سارے ہندوستان کے اردو مدارس میں نصابی ضرورتوں کی تکمیل کیا کرتی تھیں۔ 1956ء کے بعد ملک میں ریاستوں کی تنظیم جدید کی وجہ سے ہر ریاست نے اپنا نصاب علیحدہ ترتیب دیا تو مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کی نصابی کتابوں کی اہمیت میں کمی واقع ہوئی لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اردو کے تصنیفی اداروں میں مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کا بھی قابل قدر مقام ہے۔ اس ادارے نے خوبصورت طباعت اور مصور کتابوں کی اشاعت کے ذریعہ اردو دنیا میں نام کمایا اور اس ادارے کی تصانیف کا سلسلہ آج بھی جاری ہے اور اس کی جانب سے ہر ماہ شائع ہونے والا رسالہ ''کتاب نما'' بہت معروف ہو گیا ہے

سرسید بک ڈپو، علی گڑھ

اگرچہ سرسید احمد خاں کی ایما پر اردو میں علوم وفنون کی کتابیں شائع کرنے کے لیے انجمن ترقی اردو کا قیام عمل میں لایا گیا تھا۔ لیکن 1903ء کے بعد اس ادارے کو مولوی عبدالحق نے ملک گیر ادارے کا درجہ دے دیا۔ جس کے بعد علیگڑھ کی تصنیفی و تالیفی ضرورتوں کی تکمیل کے لیے اس جامعہ سے وابستہ مختلف قلمکاروں نے سرسید بک ڈپو کی بنیاد رکھی جس کے اغراض و مقاصد علیگڑھ کے ادیبوں اور شاعروں کی تصانیف کی اشاعت قرار

پائے۔اگر چہ کتابوں کی اشاعت کے سلسلہ ہی میں علوم وفنون کو بھی اہمیت دی گئی لیکن سرسید بک ڈپو کو ادبی تصانیف پیش کرنے کے باعث بڑی قدر ومنزلت سے دیکھا جانے لگا۔اس ادارے سے علیگڑھ کے بیشتر اساتذہ وابستہ رہے ہیں جن کی علمی وادبی خدمات پر پیش کردہ اہم کتابیں شائع ہوتی رہتی ہیں۔اس ادارے نے ایک دو ماہی رسالہ ''الفاظ'' کی اشاعت کا سلسلہ شروع کیا تھا لیکن وہ بند ہوگیا۔ادب اور ادبی موضوعات کے علاوہ تاریخ ادب اور تحقیق وتنقید میں سرسید بک ڈپو کی جانب سے شائع شدہ کتابیں ساری اردو دنیا میں شہرت رکھتی ہے۔اس ادارے نے کئی کتابیں مرتب کر کے شائع کیں۔جس کی وجہ سے اردو شعرا وادبا کے منتخبہ ادبی کارناموں کی اشاعت عمل میں آئی۔

ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس۔دہلی

اردو کتابوں کی اشاعت اور ان کی نکاسی کی غرض سے دہلی میں قائم شدہ اس ادارے نے شعر وادب اور تحقیق وتنقید کی نمایاں خدمات انجام دیں۔خاص طور پر تاریخ ادب کی تحقیقی کاوشوں کو منظرِ عام پر لانے میں اس ادارے کی خدمات کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ابتدا میں اس ادارے نے کتابوں کی فروخت کا سلسلہ شروع کیا لیکن رفتہ رفتہ اردو کتابوں کی اشاعت کی ذمہ داری بھی اسی ادارے نے قبول کی۔خاص طور پر وپ تخلیقات جو پاکستان میں ادب اور ادبیات کے تعلق سے منظر عام پر آرہی ہیں انہیں ہندوستان گیر شہرت دلانے میں ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس کے کارناموں کو قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔

فروغ اردو لکھنؤ

اردو کے تصنیفی اداروں میں فروغ اردو لکھنؤ کو خاص اہمیت حاصل رہی ہے۔اس ادارے کے توسط سے ایک رسالہ ''فروغِ ادب'' بھی شائع ہوتا تھا۔جس کے خاص نمبروں میں حالی، شبلی اور چکبست نمبر اہمیت کے حامل ہیں۔اس ادارے کی جانب سے ادبی تنقید اور ادبی تاریخ کے علاوہ بے شمار کتابیں شائع ہوتی رہیں جس کا سلسلہ آج تک جاری ہے۔فروغ اردو نے جہاں نئی کتابوں کی اشاعت پر توجہ دی وہیں قدیم نادر و نایاب کتابوں کی اشاعت کا سلسلہ بھی شروع کیا۔اس ادارے کا مقصد ادب کی خدمت رہا ہے۔اردو کے بیشتر نقادوں کی کتابیں، قدیم تذکرے، مختلف ناول اور لغات کی اشاعت کا کام اس ادارے نے انجام دیا اور آزادی کے بعد اس ادارے کی خدمات کا سلسلہ وسیع ہوتا گیا لیکن ادارہ فروغ اردو لکھنو کے کتب خانے میں آگ لگ جانے کی وجہ سے اس ادارے کی اشاعتی خدمات میں تعطل پیدا ہوگیا ہے۔رسالہ فروغ ادب کی بھی مسدودی کے باعث اس ادارے کی خدمات کا سلسلہ دراز ہوتا نظر نہیں آتا۔تاہم اس ادارے کی خدمات کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا ہے۔

نسیم بک ڈپو، لکھنو

اردو کی تاریخی اور نیم تاریخی، علمی وادبی کتابوں کی اشاعت کا ذمہ اپنے سر لیتے ہوئے نسیم بک ڈپو نے لکھنؤ میں اپنی خدمات کا آغاز کیا۔اس ادارے سے عبدالحلیم شرر لکھنوی، صادق حسین سردھنوی، اسلم جیراجپوری، آل احمد اور ایسے ہی بے شمار تاریخی ناول نگاروں کی تصانیف کی اشاعت کا سلسلہ جاری رہا۔اس ادارے نے بچوں کے ادب پر بھی توجہ دی اور انتہائی خوبصورت کتابیں شائع کیں۔تنقید وتحقیق کے سلسلے میں بھی اس ادارے کی تصانیف اعتبار کا درجہ رکھتی ہیں لیکن خاص طور پر افسانوی ادب کی اشاعت میں اس ادارے نے گراں قدر خدمات انجام دی ہیں۔ضخیم اور قدیم تاریخی ناولوں کی اشاعت اور پھر اس کی دوبارہ اشاعت کا کام نسیم بک ڈپو نے بہ حسن وخوبی انجام دیا۔اس ادارے کی بے شمار کتابیں مختلف کتب خانوں میں محفوظ ہیں۔

شگوفہ پبلکیشن، حیدرآباد

زندہ دلان حیدرآباد کا ایک ترجمان ماہنامہ شگوفہ ابتدا میں ڈیڑھ ماہی تھا۔اس ادارے نے جہاں طنز ومزاح کے فروغ میں حصہ لیا وہیں طنزیہ اور مزاحیہ ادب اور دوسری ادبی تخلیقات کی اشاعت کی طرف بھرپور توجہ دی۔مختلف حیدرآبادی ادیبوں جسے مسیح انجم، یوسف ناظم، پرویز یداللہ

مہدی، ڈاکٹر حبیب ضیا، ڈاکٹر عباس متقی وغیرہ کی کتابیں شگوفہ کے ادارے سے شائع ہوئیں۔ اس کے علاوہ ماہنامہ شگوفہ کے خاص نمبروں میں ڈرامہ نمبر اور ہندوستانی ادب نمبر کے علاوہ مختلف طنز ومزاح نگاروں کی رحلت پر شائع ہونے والی خصوصی اشاعتیں اہمیت کی حامل ہیں۔ ادارہ شگوفہ نے طنز و مزاح کی تاریخ مرتب کرنے کے لیے مقالے بھی شائع کیے اور بے شمار تصانیف کی اشاعت بھی کی۔ شہر حیدرآباد ہی نہیں بلکہ عالمی سطح پر اردو کے طنز ومزاح نگاروں کو متحد کرنے میں ادارہ شگوفہ ایک اہم کردار کا حامل ادارہ ہے جس نے حیدرآباد کے سنجیدہ کاموں کی ہمت افزائی کی ذمہ داری بھی قبول کی۔ چنانچہ حیدرآباد میں بیرونی مشاہیر و ہندوستان میں طنز ومزاحیہ ادب جیسے موضوعات کو بھی اپنے دائرہ کار میں شامل کیا۔ چنانچہ اس قسم کی تحقیقی کتابیں بھی شگوفہ پبلکیشن کے یادگار کارناموں کا درجہ رکھتی ہیں۔ اس ادارے نے شعری مجموعوں کے بجائے نثری کتابوں کی اشاعت پر توجہ دی اور بلاشبہ کہا جائے تو بے جانہ ہوگا کہ شگوفہ پبلکیشن کی اشاعتی کاوشوں کے باعث کئی طنزیہ اور مزاحیہ نثر نگار و شعرا منظر عام پر آئے اور انہوں نے ہندوستان گیر شہرت حاصل کی۔ زندہ دلانِ حیدرآباد کے توسط سے جاری اس ادارے نے اگرچہ مالی اعانت کا طریقہ اختیار نہیں کیا لیکن ادیبوں کی کتابوں کی اشاعت کے ذریعہ مختلف ادیبوں کے کارناموں کو اردو دنیا میں متعارف کروانے کا کارنامہ انجام دیا۔

ادبی ٹرسٹ حیدرآباد

حیدرآباد کی ادبی شناخت کو برقرار رکھنے اور اس علاقے کے مصنفین کی کتابوں کی اشاعت اور ان کی نکاسی کی غرض سے ادارہ سیاست نے ادبی ٹرسٹ کی بنیاد رکھی۔ روزنامہ سیاست کے توسط سے بھی کئی کتابیں شائع ہوئیں۔ جن کی نکاسی کے لیے ادبی ٹرسٹ کے وسیلے کو استعمال کیا گیا۔ روزنامہ سیاست نے ''حیدرآباد تب اور اب''۔ ''گذشتہ حیدرآباد''۔ ''جامعہ عثمانیہ''۔ ''پیغمبرانِ حق'' اور ایسی ہی بے شمار کتابیں شائع کیں تو ان کتابوں کو عوام تک پہنچانے کے لیے ادبی ٹرسٹ کی خدمات حاصل کیں۔ اردو کتب خانے اردو مدارس اور اردو اداروں کی مالی اعانت کے لیے ادبی ٹرسٹ کی جانب سے سالانہ مشاعرہ کا انعقاد اور اس کی آمدنی عملی اور تعلیمی اداروں کے لیے مختص کرنے کا کارنامہ بھی ادبی ٹرسٹ کے ذریعہ انجام دیا گیا۔ مشاعرے سے ہونے والی آمدنی ادارہ ادبیات اردو اور اردو آرٹس ایوننگ کالج کی ترقی کے لیے استعمال کی گئی۔ اور اس کے علاوہ کئی اداروں کی امداد کے لیے ادبی ٹرسٹ نے اپنا دستِ تعاون دراز کیا۔ کتابوں کی اشاعت کے لیے اردو کے تعلیمی، علمی اداروں کی بقا کے لیے مالی اعانت ادبی ٹرسٹ کا مقصد ہے اور یہ ٹرسٹ باضابطہ ایک نگراں کمیٹی کے تحت کام کرتا ہے۔ اسی ٹرسٹ کے توسط سے اردو گھر کی تعمیر اور اردو کتب خانوں کی شروعات کا سلسلہ ساری ریاست میں پھیلنے لگا۔ ادبی ٹرسٹ کے ذریعہ منعقد ہونے والا مشاعرہ حیدرآباد میں تاریخی اہمیت کا حامل سمجھا جاتا ہے جس کو معیاری کل ہند مشاعروں میں اولین مقام حاصل ہے۔

اپنی معلومات کی جانچ

1. دلی کے سب سے بڑے تصنیفی ادارہ کا نام بتایئے؟
2. حیدرآباد کے چند تصنف اداروں کے نام بتایئے؟
3. مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کے کارنامے بیان کیجیے؟
4. مکتبہ جامعہ کے رسالے کا نام بتایئے؟
5. کسی ایک تصنیفی ادارہ کا تعارف کروایئے؟

26.8 بیسویں صدی کے اہم تعلیمی ادارے

اردو کی ترقی کے لیے بیسویں صدی کو اس وجہ سے اہمیت حاصل ہے کہ اس صدی میں نہ صرف اردو کے اہم تعلیمی ادارے قائم ہوئے بلکہ ان تعلیمی اداروں سے وابستہ افراد نے ممکنہ طور پر شعر و ادب کی خدمات کے لیے اہم کارنامے انجام دیے۔ آزادی سے قبل بھی اردو کے کئی تعلیمی ادارے تھے جنہوں نے اردو کی ترقی و ترویج میں حصہ لیا۔ ایسے اداروں میں جامعہ ملیہ اسلامیہ، جامعہ اردو علیگڑھ، جامعہ عثمانیہ حیدرآباد اور ادارہ

ادبیات اردو کا شمار ہوتا ہے۔ آزادی سے قبل بھی مختلف دینی ادارے ہندوستان میں قائم ہوئے جنھوں نے اردو میں مذہبی ادب کے فروغ میں حصہ لیا۔ ایسے اداروں میں ندوۃ العلماء لکھنؤ' مصباح العلوم پھلواری شریف اور دارالعلوم دیوبند کے نام پیش پیش ہیں۔ ان تعلیمی اداروں نے بھی اردو کے فروغ میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ ہندوستان کی آزادی کے بعد ریاستوں کی تنظیم جدید عمل میں آئی۔ 1956ء کے بعد ہندوستان کے مختلف ریاستوں میں یونیورسٹیوں کا سلسلہ شروع ہوا تو حکومت کی طرف سے یونیورسٹیوں میں شعبہ اردو قائم کیا گیا۔ اسی طرح اردو کی ترقی و ترویج کے لیے (13) ریاستوں میں اردو اکاڈمیوں کا قیام عمل میں لایا گیا جن کے ذریعہ مشاعروں کا انعقاد' سمینار' شاعروں اور ادیبوں کو امداد اور اعزازات' مسودوں کی اشاعت اور اردو صحافت کے علاوہ ڈرامے کی ترقی کی طرف توجہ دی گئی۔ مختلف اردو اکاڈمیوں کی جانب سے کتابوں کی اشاعت کا سلسلہ بھی شروع کیا گیا۔ اتر پردیش اردو اکاڈمی دہلی اردو اکاڈمی' مہاراشٹرا اردو اکاڈمی اور آندھرا پردیش اردو اکاڈمی نے اپنے سرمائے سے اہم اردو کی کتابیں شائع کیں۔ اردو کے شاعروں اور ادیبوں کی تخلیقات کی اشاعت کے لیے فخر الدین علی احمد میموریل کمیٹی لکھنؤ کی جانب سے مالی اعانت کا سلسلہ بھی جاری ہے جو اس بات کا ثبوت ہے کہ بیسویں صدی اردو میں نہ صرف اہم تعلیمی ادارے قائم کیے گئے بلکہ کئی اکاڈمیوں کے قیام کی وجہ سے تعلیم کی ترویج کے مواقع بھی فراہم ہوئے۔ اردو مدارس کے قیام اور تعلیم میں اردو کے موقف کو منوانے کے لیے کئی تحریکیں بھی بیسویں صدی کی دین ہیں۔ اس طرح بیسویں صدی میں اردو کی ترقی کے لیے ہمہ جہت کوشش کی گئی اور ملک کی ہر ریاست میں خود حکومتی سطح پر قائم محکمہ تعلیمات اور ٹکسٹ بک بیورو کے ذریعہ اردو نصابی کتابوں کی اشاعت اور اردو تعلیم و تدریس کے علاوہ امتحانات کا سلسلہ بھی جاری ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ آزادی کے بعد تعلیمی اداروں کے قیام کے علاوہ اردو کتابوں کی فراہمی کے لیے ہر ریاست نے اپنی ذمہ داری نبھائی ہے۔ بیسویں صدی کے چند اہم تعلیمی اداروں کا تعارف پیش ہے۔

جامعہ ملیہ اسلامیہ

بیسوں صدی کے تعلیمی اداروں میں جامعہ ملیہ اسلامیہ ایک اہم کردار کا حامل ادارہ ہے۔ اس ادارے کے توسط سے اسلامی علوم و فنون اور جدید علوم کی تعلیم و تدریس کا انتظام کیا گیا۔ عرصہ دراز تک اس ادارے کے انتظامی امور دہلی کے نامور مسلمانوں کے ہاتھ میں تھے اور مسلمانوں کے سرمائے سے اس ادارے کے کاروبار جاری و ساری تھے۔ 1923ء سے یہ ادارہ کارگر ہے لیکن آزادی کے بعد ہندوستانی حکومت نے نہ صرف اس ادارے کے لیے گرانٹ کا اجرا کیا بلکہ اس کو خود مختار (Autonomous) یونیورسٹی کا درجہ دیا اور تمام مالی مصارف یو۔جی۔سی کے ذمہ کر دیے جس کے نتیجہ میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کی کارکردگی میں مزید اضافہ ہوا۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ میں جہاں اسلامی علوم کی تعلیم دی جاتی ہے وہیں علوم السنہ اور جدید علوم کی تعلیم کا اہتمام بھی کیا گیا۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے مشرقی شعبہ کو ہندوستان گیر شہرت حاصل ہے اور اس ادارے سے اردو کے بے شمار شاعر و ادیب وابستہ رہے ہیں۔ مولانا محمد علی جوہر نے اس ادارے کے قیام کے ذریعہ جو خواب دیکھا تھا اور حکیم اجمل خاں نے اپنی مالی اعانت کے ذریعہ اس ادارے کو جس مقام تک پہنچانے کی کوشش کی تھی۔ ان کے خوابوں کی تعبیر اس ادارے سے نمایاں ہوتی نظر آتی ہے۔ جامعہ ملیہ میں تدریس کے علاوہ تحقیق کا کام بھی انجام دیا جاتا ہے اور اس ادارے سے وابستہ اساتذہ کی تعلمی و ادبی تحقیقات کو مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کی جانب سے شائع کیا جاتا رہا ہے۔ اس تعلیمی ادارے کے شعبۂ تاریخ' شعبۂ سیاست' شعبۂ اسلامیات' شعبۂ عربی' شعبۂ اردو اور فارسی کو ہندوستان گیر شہرت حاصل ہے اور ادارے سے وابستہ اساتذہ اپنے تبحر علمی کی وجہ سے عالمی دورے کر کے اپنی علمیت کا لوہا منواتے ہیں۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ میں سائنس' ٹکنالوجی' آرٹس' کامرس اور علوم شرقیہ کی تعلیم و تدریس کا انتظام بھی کیا گیا ہے جبکہ اس ادارے سے انجینئرنگ' میڈیسن اور قانون کے شعبے وابستہ نہیں ہیں اس کے علاوہ اس یونیورسٹی سے کسی کالج کا بھی الحاق نہیں کیا گیا۔ اس کے باوجود بھی جامعہ ملیہ اسلامیہ ایک یونیورسٹی کا درجہ رکھتا ہے۔

جامعہ اردو علی گڑھ

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے زیر اہتمام چلائے جانے والا ادارہ جامعہ اردو علی گڑھ اس وجہ سے اہمیت کا حامل ہے کہ اس ادارے کے ذریعہ

ادیب فاضل اور ادیب کامل کے امتحانات منعقد کیے جاتے ہیں جس کا مقصد یہی ہے کہ ایسا اردو داں طبقہ جو صرف اردو کے توسط سے اپنی علمی صلاحیتوں کو پڑھانا چاہیے اسے اپنی صلاحیتوں کے استعمال کا موقع فراہم کیا جائے۔ جامعہ اردو علیگڑھ ایک مکمل طور پر آزاد ادارہ ہے جس کے شعبہ نصاب اور شعبہ امتحانات کے علاوہ وائس چانسلر اور چانسلر بھی علی گڑھ کے چانسلر اور وائس چانسلر سے الگ ہوتے ہیں۔ عام طور پر اردو کے نامور ادیب اور شاعر کو حکومت کی جانب سے اس ادارے کا چانسلر اور وائس چانسلر مقرر کیا جاتا ہے۔ جامعہ اردو علی گڑھ کے امتحانات کے مراکز ہندوستان کے مختلف شہروں اور علاقوں میں موجود ہیں جہاں ہر سال امتحانات منعقد ہوتے ہیں۔ جامعہ اردو علی گڑھ کی ان ڈگریوں کو ملک کی یونیورسٹیوں نے قبول کیا ہے۔ اسی لیے ان امتحانوں کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ اس جامعہ کا نصاب بھی حد درجہ جدید ہے جس میں اس بات کو ملحوظ رکھا گیا ہے کہ سائنس، ریاضی اور جغرافیہ جیسے تکنیکی علوم کو نصاب سے مربوط نہ کیا جائے بلکہ علم زبان، علم تاریخ، علم ثقافت اور تہذیب وتمدن کو نصاب میں شامل کر کے طلبا کی ذہنی سطح کو بلند کیا جائے۔ اس مقصد سے جامعہ اردو علی گڑھ اپنی کارکردگی کو سارے ہندوستان میں وسعت دے رہا ہے اور یہ بڑی خوش آئند بات ہے کہ اس ادارے کے امتحانات میں ہر سال لاکھوں طلبا شریک ہوتے اور ڈگری حاصل کر کے جدید یونیورسٹیوں میں داخلے حاصل کرتے ہیں۔ جامعہ اردو علی گڑھ کے ملک بھر میں کئی مراکز ہیں جو جامعہ کی نصابی کتب کی فراہمی کے ذمہ دار ہیں اس اس یونیورسٹی کو سارے ہندوستان میں پہلی مرتبہ اردو فاصلاتی طرز تعلیم کو فروغ دینے کا اعزاز بھی حاصل ہے۔

جامعہ عثمانیہ، حیدرآباد

بیسویں صدی کی دوسری دہائی میں حیدرآباد کے نظام میر عثمان علی خان نے اردو ذریعۂ تعلیم کو عام کرنے کی غرض سے 1918ء میں ایک ملکی یونیورسٹی کے قیام کا اعلان کیا جسے جامعہ عثمانیہ حیدرآباد کا نام دیا گیا۔ اس یونیورسٹی میں علوم عمرانیات، علوم السنہ سائنس، طب، انجینئرنگ، قانون اور تدریسیات کی تعلیم اردو ہی میں دی جاتی تھی چنانچہ انٹرمیڈیٹ سے لے کر گریجویشن اور پھر پوسٹ گریجویشن کی نصابی کتابوں کی اردو میں فراہمی کے لیے جامعہ عثمانیہ میں دارالترجمہ کا قیام عمل میں لایا گیا جس کے ذریعہ نصابی کتابیں اردو میں ترجمہ کی جاتی تھیں جو اردو ذریعہ تعلیم کو فروغ دینے میں مددگار ثابت ہوئیں۔ جامعہ عثمانیہ کا ایک طویل تاریخی پس منظر ہے جس کے ذریعہ سارے ملک میں سب سے پہلے اردو کو جامعاتی سطح پر ذریعۂ تعلیم کے طور پر استعمال کیا گیا اور یہ ایک انتہائی کامیاب تجربہ رہا۔ اردو ذریعۂ تعلیم سے انٹرمیڈیٹ، گریجویشن اور پوسٹ گریجویشن کے علاوہ انجینئرنگ، میڈیسن اور قانون کی تعلیم کو عام کر کے عوام میں تعلیم وتدریس سے رغبت پیدا کرنے کا غیر معمولی کارنامہ انجام دیا۔ جامعہ عثمانیہ کے آرٹس کالج کی عمارت کی طرز تعمیر نے اسے دنیا کی اہم عمارتوں میں شامل کرادیا ہے۔ اس کے علاوہ اس جامعہ کے تعلیمی معیار نے ساری دنیا کو جامعہ عثمانیہ کی طرف متوجہ کردیا۔ 1918ء سے 1948ء تک جامعہ عثمانیہ کا ذریعۂ تعلیم اردو رہا اور اس جامعہ کے فارغ طلبا اور طالبات اردو ذریعہ تعلیم سے وابستگی کے باوجود دوسرے علوم وفنون میں اس قدر مہارت رکھتے تھے کہ انہیں عالمگیر شہرت حاصل ہوئی۔ جامعہ عثمانیہ کے تعلیمی معیار کو بلند کرنے کے لیے ملک کے کونے کونے سے قابل افراد کو حیدرآباد بلایا گیا اور انہیں جامعہ عثمانیہ سے وابستہ کیا گیا تاکہ جامعہ کا معیارِ تعلیم بلند ہوسکے۔ اس جامعہ میں جہاں مسلمانوں کو دینیات کی تعلیم لازمی تھی وہیں غیر مسلموں کے لیے اخلاقیات کی تعلیم نصاب کا درجہ رکھتی تھی جس میں ناکامی تمام مضامین میں ناکامی شمار کی جاتی تھی۔ 1948ء میں پولیس ایکشن کے بعد حکومت کی تبدیلی سے جامعہ عثمانیہ کے طرز تعلیم میں بھی تبدیلی آئی اور سینٹ کے احکام کے ذریعہ جامعہ عثمانیہ کا ذریعۂ تعلیم انگریزی کردیا گیا۔ اس وقت جامعہ کے وائس چانسلر ڈاکٹر رضی الدین صدیقی تھے جس کے بعد جامعہ عثمانیہ کے طریقۂ تعلیم کی اردو حیثیت ختم ہوگئی چنانچہ آج بھی جامعہ عثمانیہ موجود ہے لیکن اس کا ذریعۂ تعلیم اردو باقی نہیں رہا۔ جامعہ عثمانیہ کے طلبا کا ترجمان ''مجلّہ عثمانیہ'' برسہابرس تک شائع ہوتا رہا۔ جس کے خاص نمبر بھی شائع ہوتے تھے۔ اس جامعہ سے تحقیقی جریدہ ''اردوئے قدیم'' بھی شائع ہوتا رہا۔

ادارہ ادبیات اردو، حیدرآباد

جامعہ عثمانیہ کے سپوت ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور 1931ء میں لندن سے اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے حیدرآباد واپسی کے بعد اہل قلم حضرات کے تعاون سے ادارہ ادبیات اردو کا قیام عمل میں لائے جس کے ذریعہ ایک ماہنامہ رسالہ 'سب رس' کی اشاعت شروع کی اور ایک مشرقی

کتب خانہ کی ضرورت پر زور دیا گیا چنانچہ آج ادارہ ادبیات اردو کی نہ صرف ذاتی عمارت ہے بلکہ کتاب خانے میں لاتعداد کتابیں موجود ہیں اور اس کتب خانے سے شعبہ مخطوطات بھی وابستہ ہے جس میں ہزار ہا قلمی کتابیں موجود ہیں۔ ادارہ ادبیات اردو کی قلمی کتابوں کی فہرست پانچ جلدوں میں اور مطبوعہ کتب کی فہرست دو جلدوں میں شائع ہو چکی ہے۔ اس ادارے سے منسلک ایک شاندار میوزیم بھی ہے جس میں دکن کے بادشاہوں کے لباس، ظروف اور ان کی یادگار چیزوں کو محفوظ کیا گیا ہے۔ ابتدا سے ہی ادارہ ادبیات اردو نے اردو کی ترقی کے لیے جدوجہد کی۔ چنانچہ اردو امتحانات کا سلسلہ شروع کیا جس کے ذریعہ اردو دانی، اردو زبان دانی، اردو عالم اور اردو فاضل کے امتحانات منعقد کیے جانے لگے۔ ان امتحانات کے مراکز ابتدا میں ریاست حیدرآباد کے تمام اضلاع میں قائم رہے جب کہ آزادی کے بعد آندھرا پردیش اور کرناٹک اور مرہٹواڑے کے علاقوں میں اس کی شاخیں کارکرد ہیں۔ ہر سال ہزار ہا طالب علم اس ادارے سے امتحانات دیتے اور اردو کے فروغ میں حصہ لیتے ہیں۔ ادارہ ادبیات اردو سے منسلک ایک بک ڈپو اور اشاعتی مرکز بھی ہے۔ ڈاکٹر زور کے زمانے سے ہی اہل دکن کی تصانیف کی اشاعت اس ادارے کی جانب سے عمل میں لائی جاتی رہی ہے۔ اس کا سلسلہ آج بھی جاری و ساری ہے۔ ادارے کے بک ڈپو میں ہندوستان کے مختلف پبلیشروں کی کتابیں محفوظ رکھی جاتی ہیں تاکہ اردو کتابیں خریدنے کے رجحان کو پروان چڑھایا جائے۔ اس ادارے کے انتظامات کے لیے ایک دستوری اور قانونی جماعت کام کرتی ہے۔ ادارے کے اپنے اصول اور قوانین مدون ہیں اور اس ادارے کو ریاستی سطح پر امداد بھی فراہم کی جاتی ہے۔ حال ہی میں ریاست آندھرا پردیش نے اس ادارے کے امتحان اردو فاضل کو انٹرمیڈیٹ کے مماثل قرار دیا ہے جس کی وجہ سے اردو فاضل کامیاب امیدوار کسی بھی یونیورسٹی کے گریجویشن میں داخلہ لے کر اپنی تعلیم کو برقرار رکھ سکتے ہیں۔ اس ادارے سے بے شمار ہستیاں وابستہ رہی ہیں اور آج بھی اس ادارے کا مجلّہ ماہنامہ ''سب رس'' پابندی کے ساتھ شائع ہوتا ہے۔ ادارے کے عہدے داران اور اراکین اس کی ترقی میں پیش پیش نظر آتے ہیں۔

اردو آرٹس ایوننگ کالج، حمایت نگر

آزادی کے بعد شہر حیدرآباد میں انجمن ترقی اردو کی فعال کارکردگی اور جستجو کے نتیجہ میں پروفیسر حبیب الرحمٰن کی تحریک کے نتیجہ میں اردو ذریعۂ تعلیم کے کالج کے قیام پر توجہ دی گئی جس کے نتیجہ میں جدید علوم وفنون کی تدریس کا انتظام کیا گیا اور اردو آرٹس ایوننگ کالج کے نام سے حمایت نگر میں ایک تعلیمی ادارہ قائم کیا گیا جسے جامعہ عثمانیہ سے الحاق حاصل ہوا۔ اس ادارے نے پی۔ یو۔ سی اور گریجویشن کے لیے آرٹس اور کامرس کے مضامین کی تدریس کا سلسلہ شروع کیا۔ جامعہ عثمانیہ کے اصول وقوانین اور نصاب کو روبہ عمل لاتے ہوئے اردو آرٹس ایوننگ کالج نے طلبا کے داخلے کا اعلان کیا۔ ابتدا میں اس ایوننگ کالج سے وابستہ ہونے والے طلبا کی تعداد کم رہی۔ لیکن رفتہ رفتہ اردو ذریعہ تعلیم سے رغبت رکھنے والوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا جس کے نتیجہ میں کالج کے طلبہ کی تعداد بھی بہ تدریج بڑھنے لگی۔ اس کالج میں اساتذہ کا تقرر جامعہ عثمانیہ کے قوانین کے مطابق ہوتا ہے اور نصاب بھی جامعہ عثمانیہ کا رائج کردہ ہے لیکن اس کالج کی خصوصیت یہی ہے کہ تدریس اردو میں ہوتی ہے اور کتابیں بھی اردو میں فراہم کی جاتی ہیں۔ طلبا کو آرٹس اور کامرس کے مضامین کی جوابی بیاض اردو میں لکھنے کی سہولت فراہم کی گئی ہے۔ اس طرح انجمن ترقی اردو کے زیر اہتمام اردو آرٹس ایوننگ کالج ترقی کی راہ پر گامزن ہے۔ اسے شہر حیدرآباد کے منفرد کالج ہونے کا اعزاز حاصل ہے جو اردو ذریعہ تعلیم کے توسط سے نصابی اغراض کی تکمیل کرتا ہے اس کے سب سے فعال پرنسپل ڈاکٹر حسینی شاہد رہے جو اردو کے نامور محقق تھے۔ ان کی رحلت کے بعد مختلف اشخاص پرنسپل کی حیثیت سے کام کرتے رہے اور اس کالج کو ریاست گیر اہمیت حاصل ہے کیونکہ یہ اردو ذریعہ تعلیم کا جامعہ عثمانیہ سے ملحق واحد کالج ہے۔

اردو اورینٹل کالج

ہندوستان میں تعلیم کا ایک ایسا نظام بھی جاری ہے جس کے ذریعہ اورینٹل اسٹڈیز (علوم شرقیہ) کو روا رکھا جاتا ہے۔ شہر حیدرآباد میں ایسے کئی کالج ہیں جو عربی، سنسکرت اور اردو کو اورینٹل لینگویج کی حیثیت سے فروغ دینے میں اہم کردار ادا کر رہے ہیں۔ حیدرآباد میں حمایت نگر اور ناملی میں اردو کے دو اورینٹل کالج قائم ہیں۔ ان کالجوں میں نصاب کے طور پر تمام تر اردو زبان و ادب کی تعلیم دی جاتی ہے۔ عرصہ دراز تک انٹرنس،

ڈپ۔او۔ایل' بی۔او۔ایل' اور ایم۔او۔ایل کی تعلیم ان اداروں میں دی جاتی تھی جس میں اردو کے علاوہ کسی دوسری زبان کا دخل نہیں تھا۔ البتہ بی۔او۔ایل کامیاب طلبا بی۔اے کے انگریزی امتحان میں شریک ہوکر کامیابی کے بعد بی۔اے۔کی ڈگری حاصل کرسکتے تھے اور اسی بی۔او۔ایل کی بنیاد پر راست ایم۔اے میں داخلہ دیا جاتا تھا۔ اپنے دور کے تعلیمی تقاضوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے اورینٹل کالجوں کے نصاب میں تبدیلی لائی گئی اور پرانی ڈگریوں کو جدید انداز سے وضع کیا گیا۔ چنانچہ انگریزی کے ایک مضمون کو نصاب میں شامل کرکے انٹرنس کے بعد بی۔اے (لینگویجس) اور ایم۔اے (لینگویجس) کی شروعات کی گئی۔ ایسے کالجوں کو یونیورسٹی کی نگرانی میں دینے کے لیے کالج آف لینگویجس کا بورڈ آف اسٹڈیز علیحدہ قائم کیا گیا تاکہ کالجس آف لینگویجس کے تعلیمی مسائل اسی بورڈ اف اسٹڈیز کے توسط سے حل کئے جاسکیں۔ چونکہ کسی بھی تعلیمی ادارے کا تعلق اس کے اپنے نصاب سے ہوتا ہے اور نصاب کو بہتر سے بہتر بنانے میں بورڈ آف اسٹڈیز ہی کارکرد ہوسکتا ہے۔ کالج کو اپنے انداز سے نصاب مرتب کرنے کی آزادی دی گئی اور اس نصاب کے مطابق کتابوں کی فراہمی اور طلبا کو معلومات فراہم کرنے کا طریقہ اختیار کیا گیا۔ عرض اردو کی تدریس کے سلسلہ میں اورینٹل کالجوں کی اپنی علیحدہ شناخت ہے اور ان اداروں نے بھی بیسویں صدی میں تعلیمی اداروں کی حیثیت سے اہم کردار نبھایا ہے۔

مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی

آزادی سے قبل تک اردو ذریعہ تعلیم کو پوسٹ گریجویٹ سطح تک فروغ دینے کے لیے شہر حیدرآباد میں جامعہ عثمانیہ کا وجود تھا۔ جب کہ آزادی کے بعد اس طریقہ کو ختم کردیا گیا۔ تاہم یہ بڑی خوش آئند بات ہے کہ ہر ریاست میں جہاں ریاستی زبانوں کے اعتبار سے یونیورسٹی کا قیام عمل میں لایا گیا۔ وہیں پارلیمنٹ کے ایک حکم نامے کے ذریعہ 1998ء میں شہر حیدرآباد میں مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی قائم کی گئی۔ اس سے قبل ریاست آندھراپردیش میں سنٹرل یونیورسٹی آف حیدراباد اور ڈاکٹر بی۔آر۔امبیڈکر اوپن یونیورسٹی کا قیام عمل میں لایا گیا تھا۔ امبیڈکر یونیورسٹی نے انگریزی' تلگو اور ہندی کے علاوہ اردو میں بی۔اے کرنے کی سہولت فراہم کی جب مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کا قیام عمل میں آیا تو اس یونیورسٹی نے بی۔اے کا نصاب ڈاکٹر بی۔آر۔امبیڈکر اوپن یونیورسٹی سے حاصل کیا اور دوسرے کئی کورسس اردو میں شروع کیے جس کے لیے دہلی کی اندرا گاندھی نیشنل اوپن یونیورسٹی سے نصابات حاصل کیے گئے۔ گذشتہ پانچ سالوں سے مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی میں بی۔اے اور بی۔کام کی تعلیم اردو کے ذریعہ فراہم کی جاری ہے۔ اس یونیورسٹی کے سارے ملک میں نوے (90) سے زیادہ مراکز قائم ہیں جہاں عام تعطیلات کے دوران خواہش مند طلبا کو تدریس کی فراہمی کا انتظام کیا گیا ہے۔ یونیورسٹی کے قیام کے تیسرے سال ہی مختلف زبانوں میں ایم۔اے کی تعلیم کی سہولت فراہم کرنے کا اعلان کیا گیا تھا جو ممکن نہ ہوسکا لیکن یونیورسٹی کے قیام کے پانچ سال بعد ایم۔اے اردو اور انگریزی نصاب کی ترتیب نیز تقررات کا عمل جاری ہے جس کی تعلیم کیمپس اور فاصلاتی دونوں طرز تعلیم سے فراہم کی جارہی ہے اور اسی یونیورسٹی کے ذریعہ مختلف ڈپلوما کورسس کا آغاز بھی ہوچکا ہے اور یونیورسٹی کے اربابِ مجاز یہ چاہتے ہیں کہ تمام علوم وفنون کی تعلیم اسی یونیورسٹی کے ذریعہ سارے ہندوستان میں بذریعہ اردو فراہم کی جائے۔ چنانچہ اس یونیورسٹی سے بی۔ایڈ کی تعلیم کا آغاز ہوچکا ہے اور ممکن ہے کہ مستقبل قریب میں بی۔ایڈ کی تعلیم بھی عام ہوجائے۔ مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کئی تکنیکی کورسس اور جدید تعلیم کے نظام کو سارے ہندوستان میں پھیلانا چاہتی ہے۔ اس کا دائرہ کار صرف ریاست نہیں بلکہ سارا ہندوستان ہے اس لیے یہ توقع کی جاتی ہے کہ اس یونیورسٹی کے ذریعہ شروع کی جانے والی فاصلاتی تعلیم اور کیمپس تعلیم سے اردو داں طبقہ کو ضرور فائدہ ہوگا۔

فاصلاتی طرزِ تعلیم کے ادارے

ہر ریاست میں کیمپس تعلیم کے علاوہ فاصلاتی تعلیم کا طریقہ رائج ہے۔ جامعہ عثمانیہ نے عرصہ دراز تک ایک نشست میں بی۔اے اور ایم۔اے کی ڈگری حاصل کرنے کا طریقہ رائج کیا تھا جو فاصلاتی طرز کا تھا جس پر یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کی پابندی عائد ہونے کے بعد تین سالہ فاصلاتی طرز کا گریجویشن اور دو سالہ ایم۔اے کورس رائج کیا گیا ہے۔ اس مرکز کو ڈاکٹر جی۔رام ریڈی مرکز برائے فاصلاتی تعلیم کا نام دیا گیا ہے جس کے ذریعے طلبا کو نصاب سے متعلق کتابیں فراہم کی جاتی ہیں اور انہیں امتحان میں کامیابی کے بعد ڈگری دی جاتی ہے۔ اسی قسم کی فاصلاتی تعلیم

BOOK NO 095

کو عام کرنے میں ریاست کی مختلف یونیورسٹیوں نے اہم کردار نبھایا ہے۔ شہر حیدرآباد میں بی۔آر۔امیڈکر اوپن یونیورسٹی نے تین سالہ فاصلاتی کورس بی۔اے' بی۔ایس سی' بی۔کام کی شروعات کی اور اس یونیورسٹی سے ہر سال لاکھوں طلبا نے استفادہ کیا ہے۔ اس طرح دورِ حاضر میں فاصلاتی طرزِ تعلیم کے ذریعہ عام سطح پر تعلیم کو فروغ دیا جارہا ہے اور اس کی نمائندگی کرنے والے کئی ادارے ملک میں قائم کیے گئے ہیں جس میں سب سے اہم نام اندرا گاندھی نیشنل اوپن یونیورسٹی نئی دہلی کا ہے۔

اپنی معلومات کی جانچ

1. جامعہ اردو علی گڑھ کیا ہے۔
2. جامعہ ملیہ اسلامیہ کے بارے میں آپ کیا جانتے ہیں؟
3. جامعہ عثمانیہ پر نوٹ لکھیے۔
4. ادارہ ادبیات اردو کے بارے میں لکھیے۔
5. مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کے بارے میں آپ کیا جانتے ہیں؟
6. فاصلاتی تعلیم کے ادارے سے کیا مراد ہے؟

26.9 خلاصہ

ہندوستان کو علم و ادب کی ترقی و ترویج کے ایک اہم ملک کا درجہ حاصل رہا ہے۔ صدیوں سے اس ملک کی علمی و ادبی خدمات قابل ستائش رہی ہیں۔ بیسویں صدی کی ابتدائی دہائی سے ہی اس ملک کی ہمہ جہت ترقی کا آغاز ہوا اور 1947ء کے بعد ہندوستان کی آزادی نے اس ملک کی ترقی کو چار چاند لگا دیئے۔ علم و ادب کی ترقی میں تعلیمی اور تصنیفی اداروں کی خدمات کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ ہندوستان میں اٹھارویں صدی سے ہی تعلیمی اور تصنیفی اداروں کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا۔ فورٹ ولیم کالج' فورٹ سینٹ جارج کالج اور دلی کالج کے بعد مطبع نول کشور لکھنؤ نے تصنیف و تالیف کے میدان میں اہم خدمات انجام دیں۔ اردو کے تصنیفی اداروں میں انجمن ترقی اردو ایک ایسا ادارہ ہے جس نے پہلی مرتبہ خانگی تصنیفی ادارے کی حیثیت سے کام کرنا شروع کیا۔ اس کا دفتر علی گڑھ سے اورنگ آباد منتقل ہوا اور مولوی عبدالحق کی نگرانی میں انجمن کی جانب سے ریاست حیدرآباد کی نصابی کتابوں کی اشاعت کا سلسلہ شروع ہوا۔ جس کے ساتھ ہی قدیم تذکرے اور تحقیقی کتابوں کے علاوہ انجمن کی جانب سے علوم و فنون کی کتابیں بھی شائع کی گئیں۔ انجمن ترقی اردو کا سہ ماہی رسالہ ''اردو'' اور ''سائنس'' شائع ہوتے رہے۔ اس ادارے کے بعد اردو کی خدمت انجام دینے والے اہم اداروں میں دارالمصنفین اعظم گڑھ یوپی کا شمار ہوتا ہے جس کی بنیاد مولانا شبلی نعمانی نے رکھی اور جس سے سید سلیمان ندوی جیسے قابل ادیب نے وابستگی اختیار کی۔ اس ادارے نے تاریخِ اسلام اور تاریخ ہند پر بے شمار تحقیقی کتابیں تیار کرائیں اور اس ادارے کی جانب سے رسالہ ''معارف'' بھی شائع ہوتا رہا۔ دارالمصنفین کو تحقیقی کتابیں پیش کرنے کے ایک اہم تصنیفی ادارے کا درجہ حاصل ہے۔ شہر حیدرآباد کے آخری بادشاہ میر عثمان علی خاں کی کوشش سے 1917ء میں دارالترجمہ جامعہ عثمانیہ کا قیام عمل میں لایا گیا۔ جس نے جامعہ عثمانیہ کی نصابی کتابوں کو اردو میں ترجمہ کر کے شائع کرنے کی روایت کا آغاز کیا۔ اس ادارے کے ذریعے علومِ سائنس' علومِ عمرانیات' میڈیکل' انجینئرنگ اور قانون کی بے شمار کتابیں شائع ہوئیں اور اس ادارے نے اردو میں اصطلاحات کی روایت کا آغاز کیا۔

ہندوستان کی آزادی کے بعد اردو کی ہمہ جہت ترقی کے لیے مرکزی حکومت کی جانب سے کونسل برائے فروغ اردو نئی دہلی کا قیام عمل میں لایا گیا۔ اس ادارے کی جانب سے طلبا و خواتین کے لیے کتب کے علاوہ تاریخ' سائنس اور دیگر علوم پر کتابیں شائع کی جاتی ہیں کیونکہ اس ادارے کو حکومت کی سرپرستی حاصل ہے۔ اسی لیے کئی طبع زاد اور ترجمہ شدہ کتابیں اس ادارے سے شائع کی گئیں جن کی قیمت انتہائی کم رکھی جاتی ہے۔ اردو کتابوں کی اشاعت اور ان کی نکاسی میں حالی بک ڈپو' مکتبہ جامعہ لمیٹڈ' سرسید بک ڈپو' ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس' فروغ اردو' نسیم بک ڈپو' حسامی بک

ڈپو اور شگوفہ پبلکیشن نے اہم خدمات انجام دی ہیں۔ ان تصنیفی اداروں سے لاتعداد قدیم کتابیں جدید نثری اور کتابوں کی اشاعت عمل میں آئی۔ بیسویں صدی میں شاعروں اور ادیبوں کے کارناموں کو اردو دنیا میں پھیلانے کے لیے ان اداروں کی خدمات کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔

بیسویں صدی میں اردو ذریعہ تعلیم کو فروغ دینے والے کئی ایسے ادارے عالم وجود میں آئے جنہوں نے اردو درس و تدریس کے علاوہ اردو زبان و ادب کے فروغ میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ بیسویں صدی کی ابتدائی نصف صدی میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کا نئی دہلی میں قیام عمل میں لایا گیا۔ اس ادارے سے ایک رسالہ ''جامعہ'' بھی شائع ہوتا رہا۔

اسلامی علوم اور جدید علوم کے علاوہ اردو زبان اور ادب کے فروغ میں جامعہ ملیہ اسلامیہ نے اہم خدمات انجام دیں۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے جدید علوم اور مغربی علوم و فنون کو فروغ دینے میں اہم کردار نبھایا تو دوسری طرف جامعہ اردو علی گڑھ نے اردو عالم' اردو فاضل اور اردو کامل کے کورسس کا آغاز کر کے اردو ذریعہ تعلیم کے فروغ میں حصہ لیا۔ شہر حیدرآباد میں اردو ذریعۂ تعلیم کی پہلی درس گاہ جامعہ عثمانیہ کا قیام 1918ء میں عمل میں آیا۔ اس یونیورسٹی میں انٹرمیڈیٹ سے لے کر پوسٹ گریجویشن تک علوم عمرانیات' سائنس' والسنہ کی تعلیم اردو میں دی جاتی رہی۔ اس جامعہ کا سہ ماہی رسالہ ''مجلّہ عثمانیہ'' اردو کی ترقی میں ایک اہم کردار ادا کرتا رہا۔ 1948ء کے بعد جامعہ عثمانیہ کے ذریعۂ تعلیم کو انگریزی میں تبدیل کر دیا گیا۔

ادارۂ ادبیات اردو کو ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور نے شروع کیا جس کا کتب خانہ' میوزیم اور شعبہ اردو امتحانات اہمیت کے حامل ہیں۔ اردو دانی' اردو زبان دانی' اردو عالم' اردو فاضل کے علاوہ اردو کامل کے امتحانات اسی ادارے کی جانب سے ساری ریاست میں منعقد ہوتے ہیں۔ اس ادارے کے اردو فاضل کے امتحان کو ریاستی حکومت نے انٹرمیڈیٹ کے مماثل قرار دیا ہے۔ حیدرآباد میں اردو آرٹس ایوننگ کالج اور اردو اورینٹل کالجس کے علاوہ مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی نے اردو زبان کو اعلیٰ تعلیم تک فروغ دینے میں پیش قدمی کی ہے۔ اس کے علاوہ جامعہ عثمانیہ' بی۔ آر امبیڈکر اوپن یونیورسٹی کے ذریعہ اردو میں فاصلاتی ذریعۂ تعلیم کے ذریعہ ایم۔ اے تک تعلیم حاصل کرنے کی سہولت فراہم کی گئی ہے۔ اس طرح بیسویں صدی کے تصنیفی اور تعلیمی اداروں کی وجہ سے اردو زبان اور ادب کے فروغ میں اہم پیش رفت ہوئی ہے۔ اس لیے ان اداروں کی خدمات کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔

26.10 نمونۂ امتحانی سوالات

1. تصنیفی اداروں سے کیا مراد ہے؟
2. تعلیمی ادارے کسے کہتے ہیں؟
3. بیسویں صدی کے کن ہی دو اہم تصنیفی اداروں پر نوٹ لکھیے۔
4. انجمن ترقی اردو کے تصنیفی کارناموں کا جائزہ لیجیے۔
5. دارالمصنفین نے کون سی تصنیفی کارنامے انجام دیے۔
6. دارالترجمہ جامعہ عثمانیہ کی خدمات کا احاطہ کیجیے۔
7. کونسل برائے فروغ اردو کے کیا کارنامے ہیں۔
8. کن ہی تین بک ڈپو کے کارنامے بیان کیجیے۔
9. جامعہ ملیہ اسلامیہ کی تعلیمی خدمات کا احاطہ کیجیے۔
10. جامعہ اردو کے بارے میں آپ کیا جانتے ہیں؟
11. ادارۂ ادبیات اردو کی خدمات پر نوٹ لکھیے۔
12. اورینٹل کالجوں پر اظہار خیال کیجیے۔

13. فاصلاتی طرز تعلیم کی تعریف کیجیے۔
14. مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کے کیا کارنامے ہیں؟

26.11 فرہنگ

ترسیل = بھیجنا
ذرائع = ذریعہ کی جمع
دستیاب = میسر، موجود
قاری = پڑھنے والا
اجتماعیت = ایک جگہ اکٹھا ہونا
ترویج = رواج دینا
توسیع = وسیع کرنا، بڑھانا
ملک گیر = سارے ملک میں
السنہ = لسان کی جمع، زبان
مماثل = برابر
اراکین = رکن کی جمع
جوابی بیاض = جواب لکھنے کی کاپی، جوابی پرچہ
درس گاہ = پڑھانے کی جگہ، مدرسہ
طبع زاد = ایجاد یا اختراع، طبیعت سے وجود میں آنے والا
مجلّہ = رسالہ، میگزین

ابلاغ = پہنچانا، بھیجنا
تفہیم = سمجھانا
تصنیف = کتاب لکھنا
ثقافت = تہذیب، کلچر
نامزد = منتخب کرنا
نصاب = پڑھائی کا کورس
برصغیر = چھوٹا براعظم
فروغ = روشنی، نور، رونق
کاوش = کوشش
خاطر خواہ = عرضی کے مطابق
کارگرد = کارگزار، بہت کام کرنے والا
فعل = کام
اصطلاح = کسی لفظ کے لیے نیا لفظ تیار کرنا
موقف = ٹھہرنے کا مقام

26.12 سفارشی کتب

1. از شہاب الدین ثاقب — انجمن ترقی اردو کی ادبی خدمات
2. خورشید نعمانی — دارالمصنفین اعظم گڑھ کی خدمات
3. ڈاکٹر مجید الاسلام — دارالترجمہ جامعہ عثمانیہ
4. ڈاکٹر مجید بیدار — دارالترجمہ جامعہ عثمانیہ کی ادبی خدمات
5. حسن الدین احمد — جامعہ عثمانیہ

اکائی : 27 ترقی پسند تحریک

ساخت

27.1 تمہید

27.2 پس منظر

27.3 آغاز

27.4 عروج

27.5 زوال

27.6 شاعری

27.7 افسانہ

27.8 ناول

27.9 تنقید

27.10 خلاصہ

27.11 نمونہ امتحانی سوالات

27.12 فرہنگ

27.13 سفارش کردہ کتابیں

27.1 تمہید

ترقی پسند تحریک اردو کی سب سے مقبول تحریک ہے۔ اس تحریک نے ہندوستانی ادب اور خصوصیت سے اردو ادب پر گہرا اثر ڈالا۔ اس اکائی میں ہم یہ جاننے کی کوشش کریں گے کہ یہ تحریک ہندوستان میں ایک ادبی تحریک کی حیثیت سے کب رونما ہوئی۔ اس نے ادب کے مزاج اور اسلوب کا رخ کس طرح بدلا۔ یہ تحریک ادب برائے زندگی کا فلسفہ لے کر آئی تھی۔ ہم اس کے بارے میں واقفیت حاصل کریں گے۔

27.2 پس منظر

بیسویں صدی کی تیسری دہائی میں جرمنی میں ہٹلر کی سرکردگی میں فاشزم کی جڑیں مضبوط ہونے لگیں۔ پورا یورپ ایک سیاسی بحران سے گزر رہا تھا۔ بین الاقوامی فضا تیزی سے تبدیل ہو رہی تھی۔ جرمنی نے ابی سینا (حبش) پر حملہ کر دیا تھا۔ جاپان نے چین پر حملہ کر کے اس کے شمالی علاقوں پر غاصبانہ قبضہ کر لیا تھا۔ چند سامراجی طاقتیں پوری دنیا کو آپس میں بانٹ لینا چاہتی تھیں۔ دوسری جنگ عظیم کے بادل ساری دنیا میں منڈلا رہے تھے۔ ہٹلر نے ملک کے اعلیٰ درجے کے فنکاروں، سائنس دانوں اور دانش وروں کو قید کر لیا تھا یا جلا وطن کر دیا تھا۔ ٹامس مان اور ارنسٹ ٹولر جیسے عظیم ادیب اور آئن سٹائن جیسے سائنس داں جلا وطن ہو کر بے سروسامانی کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ ان ادیبوں کی گرفتاری کے خلاف یوروپ کے ادیبوں میں فاشزم کے خلاف غم و غصے کی لہر دوڑ رہی تھی۔ یوروپ اور امریکہ کے دانش ور متحد ہو کر انسانیت دشمن طاقتوں کے خلاف نبرد آزما تھے۔

جولائی 1935ء میں پیرس میں کلچر کے تحفظ کے لیے تمام دنیا کے ادیبوں کی ایک کانفرس بلائی گئی۔ پہلی بار دنیا کے سارے ادیب ایک تحریک کی شکل میں متحد ہوئے۔ اس کانفرس میں یہ طے کیا گیا کہ ادیب کو اپنے ذاتی خانوں سے نکل کر انسانوں کے اجتماعی مفاد اور تہذیب وثقافت کی اعلیٰ قدروں کے تحفظ کے لیے رجعت پسند قوتوں کے مقابل آنا چاہیے اور اپنے فن کو انسانیت کی خدمت کے لیے وقف کر دینا چاہیے۔

24 نومبر 1934ء میں ہندوستانی نوجوانوں کا ایک گروپ لندن یونیورسٹی کے ایک رسٹورنٹ نان کنگ کے پیچھے ایک کمرے میں جمع ہوا۔ ان ادیبوں نے ہٹلر کے فاشزم کی مخالفت کی۔ اس گروپ نے 1935ء میں ایک ادبی حلقے کی شکل اختیار کر لی۔ اس حلقے میں سجاد ظہیر تھے جنھوں نے 1932 میں اپنے ہم خیال ادیبوں احمد علی رشید جہاں اور محمود الظفر کے ساتھ مل کر کہانیوں کا ایک مجموعہ ''انگارے'' شائع کیا تھا۔ ان کہانیوں کے موضوعات اور لہجے میں ایسی تیزابیت تھی کہ ہندوستان کے روایتی معاشرے میں اسے قبول نہیں کیا گیا اور اس کتاب کو ضبط کر لیا گیا۔ سجاد ظہیر کے علاوہ انگریزی کے ناول نگار ملک راج آنند' بنگالی کے ادیب جیوتی گھوش اور پرمود سین گپتا اور اردو کے شاعر ڈاکٹر دین محمد تاثیر شامل تھے۔ ان لوگوں نے ایک انجمن بنائی اور اس کا نام انڈین پروگریسیو رائٹرز ایسوسی ایشن (Indian Progressive Writers Association) رکھا اور ملک راج آنند کو اس کا صدر مقرر کیا گیا۔ انجمن کے مینی فیسٹو کا مسودہ لندن ہی میں تیار ہوا۔ اس کی نقل سجاد ظہیر نے ہندوستان میں اپنے دوستوں ڈاکٹر اشرف' محمود الظفر اور ان کی اہلیہ ڈاکٹر رشید جہاں کے علاوہ احمد علی اور ہیرین مکرجی کو بھیجا۔ اس مینو فیسٹو میں جو تجاویز پیش کی گئیں تھیں وہ یہ ہیں :

1) ہندوستان کے مختلف لسانی صوبوں میں ادیبوں کی انجمنیں قائم کرنا۔

2) ان ادبی جماعتوں سے میل ملاپ پیدا کرنا جو اس انجمن کے مقاصد کے خلاف نہ ہوں۔

3) ترقی پسند ادب کی تخلیق کرنا' صحت مند ادب کا ترجمہ کرنا جس سے ہم تہذیبی پسماندگی کو مٹا سکیں اور ہندوستانی آزادی اور سماجی ترقی کی طرف بڑھ سکیں۔

4) ہندوستانی کو قومی زبان اور انڈو رومن رسم الخط کو قومی رسم الخط تسلیم کرنے کا پرچار کرنا۔

5) فکر ونظر اور اظہار خیال کی آزادی کے لیے جدوجہد کرنا۔

6) ادیبوں کے مفاد کی حفاظت کرنا۔ عوامی ادیبوں کی مدد کرنا جو اپنی کتابیں طبع کرانا چاہتے ہیں۔

انجمن کے اغراض ومقاصد کو پریم چند نے اکتوبر 1935ء میں سے اپنے رسالے ''ہنس'' میں شائع کیا اور ایک اداریہ لکھا اور ان مقاصد کی حمایت کی اور لکھا'' یہ ہمارے ادب میں ایک نئے دور کا آغاز ہے''۔ دوسری مرتبہ فروری 1936ء میں لفٹ ریویو (Left Review) لندن نے شائع کیا۔

1935ء میں سجاد ظہیر ہندوستان آئے تو انہوں نے مولوی عبدالحق' منشی پریم چند' جوش ملیح آبادی اور منشی دیا نرائن نگم سے ملاقات کی جو دسمبر 1935ء میں ہندوستانی اکیڈیمی الہ آباد کی ایک کانفرنس میں شرکت کے لیے آئے تھے۔ ان ادیبوں اور دانشوروں نے مینی فیسٹو کے مقاصد سے اتفاق کیا اور اس پر دستخط کیے۔

الہ آباد میں احمد علی کے علاوہ فراق گورکھپوری اور ڈاکٹر اعجاز حسین تھے۔ ہندی کے ادیب شیودان سنگھ چوہان اور نریندر شرما تھے۔ احتشام حسین اور سید وقار عظیم اس وقت ایم۔اے کے طالب علم تھے۔ ان سب نے سجاد ظہیر کے منصوبے کی تائید کی۔ پنڈت امرناتھ جھا' وائس چانسلر الہ آباد یونیورسٹی اور ڈاکٹر تاراچند نے ان کی حوصلہ افزائی کی۔ الہ آباد میں ترقی پسند ادیبوں کا ایک حلقہ بن گیا۔ جس میں ہندی اور اردو کے ادیب شامل تھے۔

علی گڑھ میں ترقی پسند مصنفین کا پہلا اجلاس 1936ء کے اوائل میں خواجہ منظور حسین کے مکان پر ہوا۔ سردار جعفری، جان نثار اختر، حیات اللہ انصاری، اسرار الحق مجاز، اختر حسین رائے پوری، خواجہ احمد عباس، شاہد لطیف اور سبط حسن وغیرہ اشتراکیت میں دلچسپی رکھتے تھے۔ سبط حسن ان دنوں حیدرآباد میں قاضی عبدالغفار کے اخبار "پیام" میں کام کررہے تھے۔ انہوں نے حیدرآباد میں اس کو منظم کیا۔ ہرین مکرجی نے کلکتہ میں انجمن کی تشکیل کی۔ پنجاب میں محمود الظفر، رشید جہاں، فیض احمد فیض نے انجمن بنائی۔ پنجاب میں میاں افتخار الدین و فیروز الدین منصور نے بھی اس تحریک کے فروغ میں نمایاں حصہ لیا۔ بہار میں سہیل عظیم آبادی اور اختر اورینوی نے ایک حلقہ قائم کرلیا۔ اس طرح یہ تحریک سارے ہندوستان میں پھیل گئی۔

اپنی معلومات کی جانچ

1. لندن میں ہندوستانی نوجوانوں نے اپنی انجمن کا نام کیا رکھا؟

(ا) انڈین رائٹرز ایسوسی ایشن (ب) پروگریسیو ایسوسی ایشن (ج) انڈین پرگریسیو رائٹرز ایسوسی ایشن (د) پروگریسیو انڈین ایسوسی ایشن

2. افسانوں کا مجموعہ "انگارے" کس سنہ میں شائع ہوا

(ا) 1932ء (ب) 1935ء (ج) 1936ء (د) 1938ء

3. علی گڑھ میں ترقی پسند مصنفین کا پہلا اجلاس کس کے مکان پر ہوا۔

(ا) سردار جعفری (ب) حیات اللہ انصاری (ج) شاہد لطیف (د) خواجہ منظور حسین

27.3 آغاز

ترقی پسند تحریک پہلی ادبی تحریک تھی جس میں مختلف زبانوں کے ادیب نظریاتی اتحاد کی وجہ سے ایک پلیٹ فارم پر جمع ہورہے تھے۔ اس بات کو محسوس کیا جانے لگا کہ ایک کانفرنس بلائی جائے جس میں دمک کے ادیب جمع ہوکر ایک دوسرے سے تبادلۂ خیال کریں اور انجمن کا ایک لائحہ عمل تیار کریں۔ انجمن کا دستور مرتب کریں۔ پوری دنیا میں سرمایہ دارانہ نظام کے پیدا کردہ سیاسی بحران سے تہذیب و کلچر کو جو خطرات درپیش ہیں ان کے تدارک کے لیے تمام ادیب متحد ہوکر ایسی سیاسی قوتوں کا ساتھ دیں جو ترقی پسند خیالات رکھتی ہوں۔ ترقی پسند ادیبوں نے پہلی کانفرنس اپریل 1936ء میں لکھنو میں بلائی۔ استقبالیہ کمیٹی کے صدر صاحب طرز ادیب چودھری محمد علی ردولوی منتخب کیے گئے۔ اس کانفرنس میں پریم چند، مولانا حسرت موہانی، جئے پرکاش نرائن، کملا دیوی چٹوپادھیائے، میاں افتخار الدین، یوسف علی مہر، اندولال یاجنک وغیرہ نے شرکت کی۔ بنگال، گجرات، مہاراشٹرا اور مدراس کے ادیب شریک ہوئے اور اپنی زبان و ادب کے مسائل پر تقریریں کیں۔ اس کانفرنس کو دو چیزوں کی وجہ سے اہمیت حاصل ہے۔ ایک اعلان نامہ دوسرا پریم چند کا خطبہ صدارت!

اعلان نامہ میں کہا گیا کہ ہندوستانی مصنفین کا یہ فرض ہے کہ ملک میں جو ترقی پذیر رجحانات ابھر رہے ہیں ان کی ترجمانی کریں اور ان کی نشوونما میں حصہ لیں۔ بے بنیاد روحانیت اور تصور پرستی چھوڑ کر عقلیت کو اختیار کریں۔ ادبیات اور دیگر فنونِ لطیفہ کو قدامت پرستوں سے نجات دلا کر عوام کے دکھ سکھ اور جدوجہد کا ترجمان بنائیں۔ نیا ادب ہماری زندگی کے بنیادی مسائل بھوک، افلاس، سماجی پستی اور غلامی کو موضوع بنائے۔ انجمن کے مقاصد یہ ہوں گے:

1. تمام ہندوستان کے ترقی پسند مصنفین کی امداد سے مشاورتی جلسے منعقد کرنا اور لٹریچر شائع کرکے اپنے مقاصد کی تبلیغ کرنا۔
2. ترقی پسند مضامین لکھنے اور ترجمہ کرنے والوں کی حوصلہ افزائی کرنا اور رجعت پسند رجحانات کے خلاف جدوجہد کی کوشش کرنا۔

3. ترقی پذیر مصنفین کی مدد کرنا۔

4. آزادئ رائے اور آزادئ خیال کی حفاظت کی کوشش کرنا۔

پریم چند نے خطبۂ صدارت میں کہا:

''ادب کی بہت سی تعریفیں کی گئی ہیں لیکن میرے خیال میں اس کی بہترین تعریف تنقید حیات ہے ..... ہمیں حسن کا معیار تبدیل کرنا ہوگا۔ ابھی تک کا معیار امیرانہ اور عیش پرور آنہ تھا۔ ہمارا آرٹسٹ امرا کے دامن سے وابستہ رہنا چاہتا تھا انہیں کی قدردانی پر اس کی ہستی قائم تھی .....

ہمارا آرٹ شہابیات کا شیدائی ہے اور نہیں جانتا کہ شباب سینے پر ہاتھ رکھ کر شعر پڑھنے اور صنف نازک کی کج ادائیوں کے شکوے کرنے یا اس کی خود پسندیوں اور چونچلوں پر سر دھننے میں نہیں ہے۔ شباب نام ہے آئیڈیل کا' ہمت کا' مشکل پسندی کا' قربانی کا .....

پریم چند نے اس یادگار جملے پر اپنے خطبے کو ختم کیا:

''ہماری کسوٹی پر وہ ادب کھرا اترے گا جس میں تفکر ہو' آزادی کا جذبہ ہو' حسن کا جوہر ہو' تعمیر کی روح ہو' زندگی کی حقیقتوں کی روشنی ہو جو ہم میں حرکت ہنگامہ اور بے چینی پیدا کرے' سلائے نہیں کیوں کہ اب زیادہ سونا موت کی علامت ہوگی''

اس کانفرنس میں مولانا حسرت موہانی نے بھی تقریر کی۔ انہوں نے کہا ''محض ترقی پسندی کافی نہیں ہے' جدید ادب کو سوشلزم اور کمیونزم کی بھی تلقین کرنی چاہیئے اور انقلابی ہونا چاہیئے۔ اسلام اور کمیونزم میں کوئی تضاد نہیں ہے۔ اسلام کا جمہوری نصب العین اس کا متقاضی ہے کہ ساری دنیا میں مسلمان اشتراکی نظام قائم کرنے کی کوشش کریں .....

پرانی باتوں سے کام نہیں چلے گا۔ وہ محض دل بہلانے کی چیزیں ہیں۔ شاعری کے معاملے میں آپ کو میری تقلید کرنے کی ضرورت نہیں بلکہ میں خود اس قسم کے نئے ترقی پسند ادب کی تخلیق میں آپ کی پوری مدد کروں گا۔ (سجاد ظہیر ''روشنائی'' ص ۱۱۲)

اس کانفرنس میں انجمن ترقی پسند مصنفین کا دستور اساسی پیش کیا گیا جو بالاتفاق منظور ہوا۔ اس دستور کا مسودہ سجاد ظہیر' ڈاکٹر عبدالعلیم اور محمود الظفر نے مل کر تیار کیا۔ اس کانفرنس میں سجاد ظہیر کو کل ہند انجمن ترقی پسند مصنفین کا جنرل سکریٹری چنا گیا۔ لکھنؤ کی کل ہند کانفرنس کے پورے ملک میں چرچے ہونے لگے۔ پریم چند نے اپنے خطبۂ صدارت کا ہندی میں ترجمہ کیا اور رسالہ ہنس جولائی 1936ء میں شائع کیا۔ پریم چند جہاں بھی جاتے اس تحریک کا ضرور تذکرہ کرتے۔ دہلی میں اختر حسین رائے پوری نے انجمن کی شاخ قائم کی۔ ڈاکٹر عابد حسین نے تحریک کی سرپرستی کی۔ شاہد احمد دہلوی نے انجمن کے مقاصد کے لیے ایک علحدہ ماہنامہ ''شاہ جہاں'' جاری کیا۔ کانپور میں انجمن قائم ہوئی اور مولانا حسرت موہانی کو صدر منتخب کیا گیا۔ لکھنؤ اور حیدرآباد میں ترقی پسند مصنفین کی انجمن سے متاثر ہو کر نوجوان اس کے قریب آنے لگے۔ سجاد ظہیر اور ڈاکٹر اشرف نے لاہور کا سفر کیا اور وہاں علامہ اقبال سے ملاقات کی۔ اس تحریک کے مقاصد پیش کیے۔ علامہ اقبال نے ہمت افزائی کی اور کہا:

''ظاہر ہے کہ مجھے ترقی پسند ادب یا سوشلزم کی تحریک کے ساتھ ہمدردی ہے' آپ لوگ مجھ سے ملتے رہیں''

(روشنائی' سجاد ظہیر ص ۱۷۰)

ہندوستان کی دوسری زبانوں کے ادیب بھی انجمنیں قائم کرنے لگے۔ اس طرح یہ تحریک ہندوستان گیر حیثیت اختیار کرنے لگی۔

1937ء میں اردو اور ہندی کے ترقی پسند ادیبوں نے الہ آباد میں ایک کانفرنس کی۔ مجلس صدارت میں آچاریہ نریندر دیو' پنڈت رام نریش ترپاٹھی اور مولوی عبدالحق شامل تھے۔ مولوی عبدالحق اس کانفرنس میں شرکت نہ کر سکے لیکن اپنا خطبۂ صدارت بھیج دیا۔ انہوں نے ترقی پسندوں کی حوصلہ افزائی کی۔

الہ آباد میں 1938ء میں پھر ایک کانفرنس بلائی گئی۔ مجلس صدارت کے لیے جوش ملیح آبادی' آنند نرائن ملا اور ہندی کے مشہور شاعر سمترانندن پنت کا نام منتخب کیا گیا۔ اس کانفرنس میں پنڈت نہرو نے تقریر کی۔ انہوں نے کہا:

''ادیب کی پہنچ جہاں ہوتی ہے وہاں سیاست داں کی نہیں۔ اس کے پاس عام لوگوں کی زبان ہوتی ہے' اس سے مدد لے کر وہ خیالی دنیا اور موجودہ دنیا کے درمیان ایک پُل بناتا ہے جس پر ہو کر عام لوگوں کے دماغ خیالی دنیا تک پہنچ جاتے ہیں تو پھر واقعی پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں .....

آنے والے انقلاب کے لیے ملک کو تیار کرنا' اس کی ذمہ داری ادیب پر ہوتی ہے۔ آپ لوگوں کے مسئلوں کو حل کیجیے' ان کو راستہ بتائیے لیکن آپ کی بات آرٹ کے ذریعہ ہونی چاہیئے نہ کہ منطق کے ذریعے۔ آپ کی بات ان کے دل میں اتر جانی چاہیئے۔ ہندوستان میں ادیبوں نے بڑا اثر کیا ہے مثلاً بنگال میں ٹیگور نے لیکن ابھی تک ایسے ادیب کم پیدا ہوئے جو ملک کو زیادہ آگے لے جاسکیں۔ انجمن ترقی پسند مصنفین کا قیام ایک بڑی ضرورت کو پورا کرتا ہے اور اس سے ہمیں بڑی امیدیں ہیں۔ (نیا ادب جنوری/فروری 1941)

الہ آباد کی اس کانفرنس میں ٹیگور نے جو پیغام بھیجا اس کی بڑی اہمیت ہے۔ اپنے پیغام کے آخر میں انہوں نے لکھا۔

''یاد رکھو تخلیق ادب بڑے جوکھوں کا کام ہے۔ حق اور جمال کی تلاش کرنا ہے تو پہلے 'انا' کی کینچلی اتارو' کلی کی طرح سخت ڈنٹھل سے باہر نکلنے کی منزل طے کرو پھر دیکھو کہ ہوا کتنی صاف ہے' روشنی کتنی سہانی ہے اور پانی کتنا لطیف ہے۔'' (نیا ادب جنوری/فروری 1941)

اپنی معلومات کی جانچ

1. پریم چند نے خطبۂ صدارت میں کیا کہا؟

(ا) ادب کی بہترین تعریف تنقید حیات ہے۔ (ب) ادب دل بہلانے کی چیز ہے۔
(ج) ادب برائے ادب ہی سچا نظریہ ہے۔ (د) آزادی کا جذبہ ادب کے لیے مضر ہے۔

2. شاہد احمد دہلوی کے رسالے کا کیا نام تھا۔

(ا) پیام (ب) نیا ادب (ج) ادب لطیف (د) شاہ جہاں

3. پنڈت نہرو نے الہ آباد کی کس کانفرنس میں تقریر کی۔

(ا) 1938ء (ب) 1937ء (ج) 1939ء (د) 1935ء

27.4 عروج

دسمبر 1938ء کے آخری ہفتے میں ترقی پسند مصنفین کی دوسری کل ہند کانفرنس کلکتہ میں ہوئی۔ اس کی صدارت ملک راج آنند نے کی۔ اس کانفرنس میں بنگالی زبان کے کئی اہم ادیب و شاعر شریک ہوئے۔ اردو' بنگالی' گجراتی' مراٹھی اور تامل ادب کے رجحانات پر تقریریں ہوئیں۔ ڈاکٹر عبدالعلیم کو اس کانفرنس میں کل ہند انجمن کا جنرل سکریٹری منتخب کیا گیا۔

دو ڈھائی سال کے اندر ترقی پسند ادیبوں کی تحریک تمام ہندوستانی زبانوں میں مقبول ہوگئی۔ اقبال' ٹیگور' پریم چند' عبدالحق' جواہر لال نہرو' سروجنی نائیڈو' آچاریہ نریندر دیو اور جئے پرکاش نرائن جیسے دانشوروں نے ترقی پسندوں کی حوصلہ افزائی کی۔ ہندوستان بھر کے نوجوان اس رجحان

سے متاثر ہورہے تھے۔ بنگالی زبان کے مشہور رسالے ''پرچے'' نے ترقی پسند ادیبوں کے مضامین اور نظموں کو اہتمام سے شائع کرنا شروع کیا۔ حیات اللہ انصاری جو کانگریس کے ترجمان ''ہندوستان'' کے ایڈیٹر تھے۔ انہوں نے ترقی پسند ادیبوں وشاعروں کی تخلیقات کو شائع کیا۔ ترقی پسندوں نے خود اپنا رسالہ ''نیا ادب'' لکھنو سے جاری کیا۔ مجلس ادارت میں سبط حسن' علی سردار جعفری اور مجاز شامل تھے۔ ''نیا ادب'' بے حد مقبول ہوا۔ اس کی مقبولیت سے حوصلہ پاکر نوجوان ادیبوں نے اپنا ایک اشاعتی ادارہ امداد باہمی کے اصولوں پر'' حلقہ ادب'' کے نام سے قائم کیا۔ جس کے تحت سجاد ظہیر کی ''لندن کی ایک رات'' (ناول) حیات اللہ انصاری کی کہانیوں کا مجموعہ ''انوکھی مصیبت'' مجاز کا مجموعہ کلام ''آہنگ'' اور سردار جعفری کے افسانوں کا مجموعہ ''منزل'' شائع کیے گئے۔ جوش ملیح آبادی اپنا رسالہ ''کلیم'' بند کرکے نیا ادب کے ادارے میں شامل ہوگئے۔ ''نیا ادب'' عروج پر تھا۔ ملک راج آنند' ڈاکٹر عبدالعلیم اور احمد علی کی ادارت میں انگریزی ماہنامہ انڈین لٹریچر شائع کیا گیا۔ بنگالی زبان کا ''پرچھوٹیا'' اور ''پرگتی'' مراٹھی کا ''چترا'' ہندی کا ''روپاب'' اور ''ویلو'' بھی مقبول حاصل کرنے لگے۔ ہندوستان کی ساری زبانوں میں ترقی پسند مصنفین کی تحریریں مقبول ہونے لگیں۔

تیسری کل ہند کانفرنس :

ترقی پسند مصنفین کی تیسری کل ہند کانفرنس مئی 1942ء میں دہلی میں منعقد ہوئی۔ دوسری جنگ عظیم کا خطرہ سر پر تھا۔ بین الاقوامی سیاسی حالات بہت ہی نازک موڑ پر آگئے تھے۔ ترقی پسند ادیب فاشزم کے خلاف اور جمہوریت کی تائید میں پہلے ہی آواز اٹھا چکے تھے۔ اس کانفرنس میں وہ ادیب بھی شریک ہوئے جو ترقی پسند تحریک سے اتفاق نہیں رکھتے تھے۔ خاص طور پر حلقہ ارباب ذوق جو ترقی پسند ادب کی تحریروں کو پروپگنڈہ کہتا تھا اور جو اشاریت و ہیئت پرستی سے متاثر تھے وہ بھی شریک ہوئے۔ اس میں سجاد ظہیر' ڈاکٹر عبدالعلیم' کرشن چندر' مجاز' سردار جعفری' سبط حسن اور رشید جہاں ایک طرف تھے تو دوسری طرف راشد' میراجی' مولانا صلاح الدین احمد مدیر'' ادبی دنیا'' اور قیوم نظر وغیرہ تھے۔ ان کے علاوہ مولانا عبدالمجید سالک اور حفیظ جالندھری اس کانفرنس میں شریک ہوئے۔ اس میں ترقی پسند ادیبوں نے قرار داد پیش کی کہ وہ فاشزم کے مخالف ہیں اور اتحادی اقوام کے ساتھ ہیں۔ لیکن ساتھ ہی برطانوی سامراج کے اس رویے کی مذمت بھی کی کہ وہ ان نازک حالات میں بھی ہندوستان کو آزادی دینے کے لیے تیار نہیں ہے۔

ایک طرف تو ترقی پسند تحریک کو سراہا گیا لیکن چار پانچ سال میں نوجوان ادیبوں نے جس طرح کا ادب تخلیق کیا انہیں دیکھ کر ترقی پسند ادیبوں کے خلاف غلط فہمیاں پھیلنے لگیں۔ اس وقت اردو ادب میں کئی میلانات تھے کچھ لوگ مقصدیت کے حامی تھے۔ کچھ جدید ادبی تحریکوں سے متاثر تھے مثلاً اشاریت اور اظہاریت' فرائڈ' بودلیر' ملارمے وغیرہ کے نظریات انہیں اپنی طرف متوجہ کررہے تھے۔ افسانوں میں تحلیل نفسی' لاشعوری کیفیات کا رجحان' شاعری میں ابہام' نئی ہیئت کی تلاش کا رجحان پرورش پانے لگا۔ شاعری میں ہیئت کے تجربے کیے جانے لگے جس کے نتیجے میں ترقی پسندی ایک مبہم اصطلاح بن گئی تھی۔

ترقی پسند ادب کے خلاف مضامین اور اس کے جواب میں وضاحت کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ نواب جعفر علی خاں اثر لکھنوی' رشید احمد صدیقی نے ترقی پسند ادب کے خلاف اعتراضات کیے۔ رشید احمد صدیقی نے انقلابی شاعری میں تخریبی رجحانات' نعرہ بازی پر اور فحاشی وعریاں نویسی پر سخت اعتراضات کیے۔ رشید احمد صدیقی نے ترقی پسند ادب کی تاریخ میں اہم رول ادا کیا جو رجحانات خلط ملط ہورہے تھے انہیں پہچانا گیا۔ ترقی پسند اور غیر ترقی پسند میں تمیز کی جانے لگی۔ ترقی پسند ادب اور نیا ادب یا جدید ادب کو الگ الگ دیکھا جانے لگا۔ رشید احمد صدیقی اور اثر لکھنوی وغیرہ کے مضامین کے جوابات احتشام حسین' سجاد ظہیر' علی جواد زیدی وغیرہ نے دیے۔ ترقی پسند تحریک کے بارے میں دوسری بحث اس وقت شروع ہوئی جب ماہر القادری نے ''اردو اصلاح ادب کانفرنس'' منعقد کی۔ اس کانفرنس میں بلینک درس کی مخالفت کی گئی۔ آزاد نظم کے شاعروں کی پیروڈی کی گئی۔ آزاد نظم کے خلاف مضامین لکھوائے گئے۔ عندلیب شادانی مسعود حسن رضوی اور نیاز فتح پوری نے آزاد نظم کو اردو شاعری کے مزاج کے خلاف بتایا۔ محمد حسن عکسری نے آزاد نظم کی پیروڈی کی سخت مذمت کی۔ ڈاکٹر عبدالعلیم نے بھی ایک تفصیلی مضمون تین قسطوں میں ''ترقی پسند ادب کے بارے میں چند غلط فہمیاں'' لکھا۔ انہوں نے بڑے مدلل انداز میں لکھا کہ آزاد نظم اردو مزاج کے خلاف نہیں ہے۔ انہوں نے آزاد نظم نگاروں کے

یہاں ابہام اور فراریت کے جو رجحانات تھے ان کا بھی تجزیہ کیا۔ انہوں نے یہ بھی وضاحت کی کہ ہیت اور اسلوب کے سلسلے میں ترقی پسندوں کا رویہ کیا ہونا چاہیے۔ انہوں نے لکھا کہ انہیں ایسا اسلوب اختیار کرنا چاہیے جو حال اور مستقبل کی ضروریات کو پورا کر سکے۔

جن دنوں یہ مباحث چل رہے تھے حیدرآباد میں کل ہند اردو کانگریس کا اجلاس ہوا۔ جس میں سجاد ظہیر کو ترقی پسند تحریک پر مقالہ پڑھنے کے لیے مدعو کیا گیا۔ اس مقالے میں سجاد ظہیر نے غلط فہمیوں کا انسداد کرنے کی کوشش کی اور ترقی پسند تحریک کی پالیسی بھی واضح کی۔

1944-43ء میں قحط بنگال کا اہم واقعہ ہوا۔ ترقی پسند تحریک سے تعلق رکھنے والے ادیبوں و شاعروں نے اسے موضوع بنا کر ظلم اور بہیمیت کے خلاف سخت احتجاج کیا۔

اکتوبر 1945ء میں ترقی پسند اردو مصنفین نے حیدرآباد میں ایک کانفرس بلائی چوں کہ اردو زبان اور ادب کے مسائل پر تفصیلی مباحث کا موقع نہیں مل رہا تھا اس لیے یہ کانفرنس منعقد کی گئی۔ یہ کانفرنس پانچ دن تک چلتی رہی۔ اس میں اردو کے تقریباً تمام اہم ادیب موجود تھے۔ اس کا افتتاح سروجنی نائیڈو نے کیا۔ ڈاکٹر تاراچند نے اردو ہندی کے اجلاس کی صدارت کی۔ فراق گورکھپوری نے شاعری کے اجلاس کی' قاضی عبدالغفار نے صحافت کے اجلاس کی' احتشام حسین نے تنقید کے اجلاس کی اور مولانا حسرت موہانی نے عام اجلاس کی صدارت کی۔ اس کانفرنس کے متعلق کرشن چندر نے ایک دلچسپ رپورتاژ ''پودے'' لکھا۔

اس کانفرنس کی اہم قرارداد ڈاکٹر عبدالعلیم نے فاشی کے خلاف پیش کی۔ اس قرارداد میں کہا گیا کہ اردو ادب میں جو فاشی کے رجحانات پرورش پا رہے ہیں اس کا ترقی پسند تحریک اور ترقی پسند ادب کے نظریے سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ ترقی پسند ادیب فاشی کے خلاف ہیں اور اس کے اظہار کو ادب کے لیے غیر صحت مند اور مضر سمجھتے ہیں۔ اس تجویز کی قاضی عبدالغفار نے مخالفت کی اور کہاں ہمیں اس قسم کی کوئی تجویز پاس کرنے کی ضرورت نہیں ہے اور نہ کسی قسم کے سخت احتساب کی ضرورت ہے۔ جنسی موضوعات پر بھی ادب کی تخلیق ہو سکتی ہے۔ بشرط یہ کہ لکھنے والے کا زاویہ نگاہ تعمیری اور ترقی پسندانہ ہو۔ جنس بھی ہمارے سماج کے اہم مسائل میں ہے۔ اس تجویز سے غلط فہمی پیدا ہو سکتی ہے کہ ترقی پسند نوجوان اس موضوع اور زندگی کے اس پہلو کو خارج سمجھ کر اس سے قطع تعلق کر لیں۔ اس قرار کی سب سے زیادہ مخالفت مولانا حسرت موہانی نے کی۔ انہوں نے کہا کہ ''ادبی تخلیقات میں لطیف ہوسنا کی کا اظہار' کوئی مضائقہ نہیں'' اس پر قرارداد مسترد ہو گئی۔

تقسیم ہند کے بعد ترقی پسند ادیبوں نے دسمبر 1947ء میں لکھنو میں ایک کانفرنس منعقد کی۔ تین دن تک مختلف اجلاس ہوئے اور ایک شاندار مشاعرہ بھی ہوا۔ کانفرنس کے افتتاح کے لیے مولانا آزاد کو مدعو کیا گیا لیکن وہ کسی وجہ سے شرکت نہ کر سکے۔ افتتاح کی رسم ڈاکٹر سید محمود نے ادا کی۔ عام جلسے کی صدارت قاضی عبدالغفار نے کی' مجلس مقالات کی صدارت رشید احمد صدیقی نے کی۔ ایک اجلاس خاص طور پر زبان کے مسئلے پر کیا گیا جس کی صدارت نیاز فتح پوری نے کی۔ مشاعرے کی صدارت حضرت اثر لکھنوی نے کی۔ انجمن کا تنظیمی جلسہ بھی ہوا جس میں یہ طے ہوا کہ ایک مرکزی دفتر بمبئی میں باقاعدہ قائم کیا جائے اور سردار جعفری کو عارضی طور پر جنرل سکریٹری بنایا جائے۔

مئی 1949ء میں ترقی پسند ادیبوں نے پانچویں کل ہند کانفرنس بھیمڑی میں منعقد کی۔ اس کانفرنس کے بعد ترقی پسند مصنفین کی تحریک میں ایک نیا موڑ آیا۔ کیوں کہ 1936ء کے مینی فیسٹو کو ناکافی سمجھ کر ایک نیا مینی فیسٹو منظور کیا گیا۔ اس زمانے میں تلنگانہ اور بنگال کی عوامی تحریکوں اور حکومت کی سیاسی پالیسی کی وجہ سے بہت سے ترقی پسند ادیب قید تھے جو جیل سے باہر تھے' وہ کشمکش میں تھے کہ حکومت کا ساتھ دینا چاہیے یا نہیں۔ سب سے اہم مسئلہ تیسری جنگ عظیم کا خطرہ تھا۔ ترقی پسند علی الاعلان امن پسند طاقتوں کا ساتھ دینے اور سرمایہ دارانہ مفاد کی خاطر دنیا کو جنگ کے جہنم میں جھونکنے والی طاقتوں سے کنارہ کشی کا اظہار کرنا چاہتے تھے۔ نئے منشور میں ان تمام مسائل کا احاطہ کیا گیا۔

نئے منشور میں کہا گیا کہ آج ترقی پسند اور رجعت پسند ایک دوسرے کے مقابل صف آرا ہیں۔ اس میں وہ جدوجہد صاف دکھائی دے رہی ہے جو ہندوستان کے عوام جمہوریت اور اشتراکیت کے لیے کر رہے ہیں۔

حکومت ہند کے اس فیصلے کی مخالفت کی گئی جس میں حکومت نے برطانوی کامن ویلتھ میں رہنے کا فیصلہ کیا ہے۔ مطالبہ کیا گیا کہ ہندوستان کو آزاد خودمختار اور عوامی جمہوریت قائم کرنا چاہیئے۔

سرمایہ دار ممالک امریکہ اور برطانیہ' سوویت یونین' پوربی یورپ کی عوامی جمہوریتوں اور ایشیا کے عوام کی جدوجہد کے خلاف جھوٹی خبریں پھیلا رہے ہیں۔

ہندوستان کا سرمایہ دارانہ طبقہ مزدوروں' کسانوں' فن کاروں پر ظلم ڈھا رہا ہے اور حکومت ان کے ساتھ ہے۔ مزدوروں' کسانوں اور متوسط طبقے کی جدوجہد کو دبانے کی بھرپور کوشش کی جارہی ہے۔ حکومت جمہوری اخباروں اور رسالوں کو بند کررہی ہے۔

سوویت یونین کی تعریف کی گئی جہاں اشتراکی سماج میں سرمایہ داروں کی آزادی ختم کی جاچکی ہے کہ وہ عوام کو دبا سکیں اس لیے وہاں جمہوریت پسندوں کو پوری آزادی ہے۔ سوویت یونین کا ادب اس وقت دنیا بھر کے ترقی پسندوں کی رہنمائی کرتا ہے۔

ترقی پسند ادیبوں سے مطالبہ کیا گیا کہ وہ عوام کے قریب آئیں۔ اعلیٰ سماجی مقصد کے بغیر ادب عظیم نہیں ہوسکتا۔ ادیبوں کو اپنی تحریروں میں سنجیدگی اختیار کرنے کے لیے کہا گیا۔ عوامی ادب اور کلچر کا مستقبل ترقی پسندوں کے ہاتھوں میں ہے اس کا یقین دلایا گیا۔ ترقی پسند ادیبوں سے کہا گیا کہ وہ عوام سے رشتہ جوڑیں۔ مزدوروں اور کسانوں کی زندگی اور جدوجہد کی عکاسی کریں۔ رومانوی اور رجعت پرست ادیبوں کے نظریے اور عمل کے ساتھ سمجھوتہ بازی سے سختی کے ساتھ منع کیا گیا۔ اس کانفرنس میں ہندی کے مشہور نقاد رام بلاس شرما کو کل ہند انجمن کا جنرل سکریٹری منتخب کیا گیا۔

نئے منشور کی اشاعت کے بعد سردار جعفری نے ایسے شاعروں سے بیزاری کا اظہار کیا جو رمزیت اور تغزل کے قائل تھے۔ انہوں نے فیض احمد فیض کی نظم ''یہ داغ داغ اجالا یہ شب گزیدہ سحر'' پر اعتراض کیا۔ سردار جعفری نے فیض اور جذبی پر اعتراض کیا اور کیفی اعظمی و جان نثار اختر کو ترقی پسند قرار دیا۔ اس منشور اور سردار جعفری کے رویئے سے لکھنے والے تذبذب کا شکار ہوگئے۔

نقوش' ماہ نو' آج کل اور نیا دور جیسے ادبی رسائل کا بائیکاٹ کیا گیا۔ بعض ادیبوں نے اس زمانے میں لکھنا چھوڑ دیا۔ کچھ ہی دنوں کے بعد ترقی پسند تحریک کے ترجمان ''شاہراہ'' کا تنزل شروع ہوگیا۔ ترقی پسندوں میں ''ادبی جمود'' پر بحث ہونے لگی۔

اپنی معلومات کی جانچ

1. ترقی پسندوں کے رسالے کا نام کیا تھا؟

(ا) پرچم (ب) نیا ادب (ج) سرخ سویرا (د) حیات

2. مسعود حسن رضوی' عندلیب شادانی اور نیاز فتح پوری نے کس صنف کو اردو کے مزاج کے خلاف بتایا؟

(ا) غزل (ب) مثنوی (ج) آزاد نظم (د) نظم معریٰ

3. نیا منشور کس کانفرنس میں جاری کیا گیا؟

(ا) حیدرآباد کانفرنس (ب) بھیمڑی کانفرنس (ج) لکھنؤ کانفرنس (د) الہ آباد کانفرنس

27.5 زوال

مارچ 1952ء میں ترقی پسند ادیبوں نے دہلی میں ایک کانفرنس منعقد کی۔ خوب مباحث ہوئے اور ایک نیا منشور منظور کیا گیا۔ اس میں کہا گیا کہ :

''ہندوستان کے لوگ چاہتے ہیں کہ ان کا ادب اور آرٹ ان کی قومی روایات کے مطابق ترقی کرے۔ ہمارے عوام کی خواہش ہے کہ ایک آزاد اور خوش حال زندگی انہیں حاصل ہو۔ وہ چاہتے ہیں کہ دنیا کی تمام قوموں کے ساتھ دوستی اور برادارانہ امن قائم رکھیں۔ ہمارا ادب انسان دوستی کے جذبے کا' زندگی پر یقین اور اعتماد کا روشن مستقبل کی امیدوں کا علم بردار ہو۔ بے مقصد زندگی' شکست پسندی' فنا پسندی اور جبر پرستی ایسے رجحانات ہیں جو ہماری تہذیب کی ترقی میں رکاوٹ بنتے ہیں۔ ہم اس ادب کے مخالف ہیں جو عریانی' فحاشی' دہشت پسندی اور غارت گری پھیلاتا ہے۔ ہمارا ادب فنی اعتبار سے خوب صورت ہونا چاہئیے۔ قومی اور عام پسند ہونا چاہئیے اور ہم چاہتے ہیں کہ ہمارے ملک کی تمام زبانوں میں ادب کے پھلنے پھولنے کے لیے تمام سہولتیں دی جائیں۔

اس کانفرنس میں کرشن چندر کو کل ہند انجمن کا جنرل سکریٹری منتخب کیا گیا۔

بہت سے ادیب اس تحریک سے بدظن ہوگئے کیوں کہ انتہا پسند ادیبوں نے تحفظ ذہنی کا مظاہرہ کیا تھا۔ کرشن چندر نے تنظیم میں کوئی خاص دلچسپی نہیں لی۔ ان کی حیثیت ایک تجارتی ادیب کی ہوتی جارہی تھی۔ شعرا بین الاقوامی مسائل پر نظمیں لکھنا چھوڑ کر غزل گوئی کی طرف راغب ہوگئے۔ مختلف شہروں سے تنظیمیں ختم ہونے لگیں۔ اسی دوران سجاد ظہیر' راول پنڈی سازش کیس سے رہا ہو کر مستقل طور پر ہندوستان واپس آ گئے۔ انہیں انجمن کو پھر سے سرگرم کرنے پر آمادہ کیا گیا۔ مارچ 1956ء میں مینو (ضلع اعظم گڑھ) میں ترقی پسند ادیب جمع ہوئے۔ یہ طے کیا گیا کہ احتشام حسین سارے ادیبوں سے خط و کتابت کر کے یہ مسئلہ طے کریں کہ کیا اردو کی ترقی پسند مصنفین کی انجمن کی الگ ضرورت ہے؟ انجمن کا نام ترقی پسند مصنفین ہی رہے یا تبدیل کر دیا جائے؟

مئی 1956ء میں حیدرآباد میں کل ہند کانفرنس ہوئی۔ بہت سے ترقی پسند مصنفین نے اس میں شرکت کی۔ مباحث ہوئے اور تحریک کے بانیوں سجاد ظہیر اور ڈاکٹر عبدالعلیم نے اس خیال کا اظہار کیا کہ موجودہ حالات میں ادیبوں کے تقاضے بدل گئے ہیں اور چوں کہ ترقی پسند نظریہ ادب اب اتنا عام ہو چکا ہے کہ اس کی تشریح یا اس کے پرچار کی ضرورت نہیں رہی بلکہ اس دور میں کم و بیش ہر ادیب اسے تسلیم کرنے لگا ہے۔

ڈاکٹر عبدالعلیم نے تقریر کرتے ہوئے کہا:

''میرا اپنا خیال ہے کہ برا یا بھلا جو بھی کام کرنا تھا انجمن کر چکی۔ اب اس تنظیم پر توجہ دینے کے بجائے ایک کل ہند اردو ادیبوں کی انجمن بنائی جائے۔ بلا لحاظ اس کے اراکین کے معاشی' سیاسی یا مذہبی نظریے کچھ بھی ہوں ہمارے پاس صرف ایک معیار ہو اور وہ یہ کہ ہر رکن لکھنے والا ہو۔ لکھنے والوں میں بھی ہم کوئی معیار یا سطح مقرر نہیں کر سکتے۔ ہر شخص کو رکن بننے کا حق ہونا چاہئیے .....

پہلے میری رائے تھی کہ انجمن کو دوبارہ منظم کرنا چاہئیے۔ مرکز اور شاخوں میں ربط پیدا کر کے اسے باعمل بنانا چاہئیے لیکن اب میں اس رائے پر قائم نہیں ہوں۔ اس کو بدلنے کے لیے تیار ہوں۔

..... آج ہند کی نئی تعمیر جمہوریت اور اشتراکیت کی بنیادوں پر قائم ہو رہی ہے جس پر عظیم اکثریت کو اتفاق ہے۔ اس نظام کو قائم کرنے کے لیے سارا ہندوستان کوشاں ہے۔ ترقی پسند مصنفین کی بنیاد یہ تھی کہ ہم آزادی حاصل کریں اور انگریز سامراج کو ہندوستان سے باہر نکالنے کی جدوجہد میں ادبی جنگ کریں۔ آج ہمارے پاس متحد ہونے کے لیے دوسری بنیاد اتحاد موجود ہے۔ ان بنیادوں پر آج تمام لکھنے والوں کو متحد کیا جاسکتا ہے۔

ہماری تنظیم کوئی سیاسی تنظیم نہیں ہوگی۔ ہمارا مقصد ادب کے ذریعہ اپنے خیالات کی ترویج ہے.....''

اس طرح ترقی پسند مصنفین کی تحریک انجام کو پہنچی۔ 1936ء سے 1956ء تک اس تحریک نے ایک اہم رول ادا کیا۔

اپنی معلومات کی جانچ

1. 1952ء کی دہلی کانفرنس میں کس بات کی مخالفت کی گئی؟

(ا) شکست پسندی وفنا پسندی کی (ب) امن و دوستی کی

(ج) فنی خوب صورتی کی (د) قومی اور عام پسند ادب کی

2. سجاد ظہیر کس کیس سے رہا ہو کر آئے؟

(ا) اسلام آباد کیس (ب) راول پنڈی سازش کیس

(ج) بھاولپور کیس (د) لاہور سازش کیس

3. مئی 1956ء میں حیدرآباد کی کانفرنس میں کیا فیصلہ کیا گیا؟

(ا) ترقی پسند تحریک کا نام بدل دیا جائے (ب) انجمن کو دوبارہ منظم کیا جائے

(ج) نئی تنظیم قائم کی جائے (د) سیاسی تنظیم بنائی جائے

27.6 شاعری

ترقی پسند شاعروں نے اختر شیرانی کی رومانیت اور جوش ملیح آبادی کی انقلابی شاعری سے متاثر ہو کر شاعری کی۔ ان کے یہاں بغاوت اور دہشت انگیزی کے ساتھ ساتھ ملک کی آزادی کا جذبہ بھی ملتا ہے۔ وہ انقلاب کے لیے ہر طرح کی قربانی دینے کے لیے تیار تھے۔ شمیم کرہانی، شہاب ملیح آبادی، وقار ابنالوی وغیرہ نے جذباتی شاعری کی جو اس دور کے نوجوانوں میں بے حد مقبول ہوئی۔ شمیم کرہانی کی نظم ''قومی سپاہی کا گیت'' ''جوان جذبے'' اور ''جگاؤ'' میں شدید وطنی جذبہ ہے۔ شہاب ملیح آبادی کی نظم ''ہٹو آتا ہے مرد انقلابی'' بھی اسی جذبے کا اظہار کرتی ہے۔ ترقی پسند شاعروں نے انقلاب اور آزادی کو ہی اپنا محبوب قرار دیا تھا۔ ان کے انقلاب کا تصور رومانی تھا۔ وہ اکثر نظمیں اپنی محبوب کو مخاطب کر کے لکھتے تھے۔ اس سے معذرت کرتے تھے کہ ان کے پاس محبت سے زیادہ اہم کام ہیں۔ اس لیے وہ محبت کا حق ادا نہیں کر سکتے۔ سردار جعفری کی ''انتظار نہ کر''، علی جواد زیدی کی نظم ''میری راہ میں'' ایسی نظمیں ہیں جن میں شاعر اپنی محبوبہ سے کہتا ہے کہ وہ ان سنگین مسائل کو سمجھ نہیں سکتی اور نہ اس کا نازک حسن ان حالات میں ساتھ دینے کا متحمل ہو سکتا ہے۔ اس کے بعد شاعروں نے اپنے محبوب کو بغاوت اور انقلاب کی تلقین کرنی شروع کر دی۔ سلام مچھلی شہری کی نظم ''شرائط'' میں وہ کہتے ہیں:

اٹھا کے ہاتھ کہے انقلاب زندہ باد
لہو سے مثل دلہن مہندیاں رچائے ہوئے

مجاز کی نظم ''نوجوان خاتون سے خطاب'' یہ شعر بے حد مشہور ہوا

تیرے ماتھے کا یہ آنچل بہت ہی خوب ہے لیکن
تو اس آنچل سے اک پرچم بنا لیتی تو اچھا تھا

ان تمام نظموں میں انقلاب کا ایک معصوم تصور ملتا ہے۔ عنفوان شباب کا جوش بھی ہے۔

ترقی پسند شاعروں نے فرسودہ نظام کو ختم کر کے ایک نئی دنیا تعمیر کرنے کے بھی خواب دیکھے۔ ان کے یہاں ایک جذباتی ہیجان' غصہ اور انتقام کی آگ بھڑکتی نظر آتی ہے۔

مجاز کی نظم ''انقلاب'' میں یہ جذبہ عروج پر نظر آتا ہے۔

جھونپڑوں میں خوں' محل میں خوں' شبستانوں میں خوں
دشت میں خوں' وادیوں میں خوں' بیابانوں میں خوں

جاں نثار اختر نظم ''ساقی'' میں کہتے ہیں:

جو ممکن ہو تو' تو بھی آج رنگیں جام کے بدلے
لہو کے رنگ میں ڈوبا ہوا پرچم اٹھا ساقی

سردار جعفری کی ایک نظم ''جوانی'' کا شعر ہے:

مرے ہونٹوں پہ نغمے کانپتے ہیں دل کے تاروں کے
میں ہولی کھیلتا ہوں خون سے سرمایہ داروں کے

جذبی کی نظم ''دعوت جنگ''۔ مخدوم کی نظم ''موت کا گیت'' اور ''مشرق'' ایسی ہی نظمیں ہیں۔ اس طرح کی نظموں کے سلسلے پر سجاد ظہیر نے بروقت روک لگائی۔ انہوں نے لکھا'' نوجوانوں سے خطاب' طالب علموں سے خطاب' سپاہی سے خطاب' مزدوروں سے خطاب اور کسانوں سے خطاب اب بند ہونا چاہیئے۔ اگر آپ کو کچھ لکھنا ہے تو آپ ملاّ پن چھوڑیے' لوگ آپ کا بھی مذاق اڑانے لگیں گے جبر تو یہ ہے کہ آپ کسی کو مخاطب نہ کیجیے۔ زمانے پر نظر ڈالیے' حالات کو سمجھیے اور جو کہنا ہو کہہ ڈالیے۔''

سجاد ظہیر کی اس تنقید کے بعد بہت سے شاعر سنبھل گئے۔ بعض نے اسی روش کو جاری رکھا۔ آگے چل کر جن شاعروں کو استحکام حاصل ہوا ان میں مجاز' مخدوم' فیض' علی سردار جعفری' کیفی اعظمی' جاں نثار اختر' ساحر لدھیانوی' مجروح سلطان پوری وغیرہ شامل ہیں۔ سلام مچھلی شہری' علی جواد زیدی' مسعود اختر جمال' شہاب ملیح آبادی' شمیم کرہانی کی شہرت ان کا دور گزرنے کے بعد ختم ہوگئی۔

اسرار الحق مجاز نے ترقی پسند شعرا میں سب سے زیادہ مقبولیت حاصل کی۔ عزیز احمد نے مجاز کی شاعری کو انقلاب اور تغزل کا حسین امتزاج قرار دیا۔ مجاز کی رومانی نظموں میں ''طفلی کے خواب'' نذر دل' ان کا جشن سالگرہ' نورا' کس سے محبت ہے ''ایک غمگین یاد''۔ ''آج کی رات'' شامل ہیں۔ خلیل الرحمٰن اعظمی لکھتے ہیں'' مجاز کی غنائیت میں چشمے کی روانی' شادابی اور عنفوان شباب کی وارفتگی اور والہانہ پن ملتا ہے''۔ مجاز کی انقلابی شاعری میں رومانیت نے خاص دل کشی پیدا کی۔ ''آوارہ' اندھیری رات کا مسافر''۔ ''رات اور ریل''۔ ''نذر خالدہ''۔ ''ایک جلاوطن کی واپسی''۔ ''نوجوان خاتون سے''۔ ''خواب سحر'' اور ''آہنگ نو'' انقلابی نظمیں ہیں۔ مجاز کی انقلابی شاعری کے بارے میں فیض نے لکھا مجاز انقلاب کا ڈھنڈورچی نہیں انقلاب کا مطرب ہے' اس کے نغمہ میں برسات کے دن کی سی سکون بخش خنکی اور بہار کی رات کی سی گرم جوش تاثیر آفرینی ہے۔''

فیض احمد فیض کا پہلا مجموعۂ کلام ''نقش فریادی'' ہے جس کے بارے میں ن۔م۔ راشد نے لکھا تھا'' یہ ایک ایسے شاعر کی نظموں اور غزلوں کا مجموعہ ہے جو رومان اور حقیقت کے سنگم پر کھڑا ہے''۔ فیض کی رومانی نظموں میں 'آخری خط' سرد شبانہ' تہ نجوم شامل ہیں۔ مجھ سے پہلی سی محبت مرے محبوب نہ مانگ' رقیب سے' تنہائی' موضوع سخن' بول کے لب آزاد ہیں تیرے' میں انہوں نے اردو شاعری کو ایک نئے آہنگ سے آشنا کیا۔ فیض بلند بانگ شاعری کے قایل نہیں تھے۔ وہ رمز و کنائے میں اپنی بات کہتے تھے۔ صبح آزادی' دو عشق' نثار میں تیری گلیوں پہ' شیشوں کا مسیحا' زنداں کی ایک شام' یاد' ملاقات' ہم جو تاریک راہوں میں مارے گئے اور دریچہ وغیرہ ان کی مشہور نظمیں ہیں۔

مخدوم نے ابتدا میں رومانی نظمیں لکھیں۔ ان نظموں میں ایک تازگی' شادابی' جمالیاتی کیف اور انداز بیان کی ندرت ہے۔ سجدہ' انتظار' محبت کی چھاؤں' نامۂ حبیب' پشیمانی ان کی رومانی نظمیں ہیں۔ مخدوم انقلاب کا انتظار بھی محبوب کے انتظار کی طرح کرتے ہیں۔ مخدوم کی شاعری میں غنائیت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ ان کی نظمیں ''اندھیرا' زلف چلیپا' چاند تاروں کا بن' چارہ گر'' فنی اعتبار سے مکمل نظمیں ہیں۔ مخدوم کے کلام کے بارے میں عزیز احمد لکھتے ہیں کہ'' خالص شاعرانہ حیثیت سے بھی اس کے کھرے ہونے میں کوئی کلام نہیں''۔

سردار جعفری کا پہلا مجموعہ کلام'' پرواز'' ہے۔ سردار جعفری کی نظموں میں وجدان اور تخلیقی عناصر کی کمی ہے۔ ان کے انداز بیان میں ایک کرختگی ہے۔ سال نو ' ٹوٹا ہوا ستارہ' آخری خط ان کی کامیاب نظمیں ہیں۔ بعد میں سردار جعفری نے طویل نظمیں لکھیں ان کے یہاں الفاظ کی تکرار ہونے لگی اور تمام مصرعے ایک ہی لفظ سے شروع ہونے لگے۔ ان کی نظمیں سیلاب چین' آنسوؤں کے چراغ' موت' نیا ودھان' زنداں بہ زنداں ' کوریا ترقی پسند حلقوں میں بے حد مقبول ہوئیں۔ ان کی طویل نظم ''نئی دنیا کو سلام'' بھی بہت مشہور ہوئی۔ سردار جعفری نے تشبیہات میں ندرت کو ملحوظ رکھا۔

کیفی اعظمی کی ابتدائی نظمیں بھی رومانی اور ہلکی پھلکی ہیں۔ اندیشہ' پشیمانی' ٹرنک کال' پامسٹ' حوصلہ اور تبسم ان کی خوب صورت نظمیں ہیں۔ کیفی اعظمی نے بھی ہنگامی موضوعات پر نظمیں لکھیں لیکن ان کے یہاں سردار جعفری کی طرح کرختگی نہیں ہے بلکہ ایک دھیمے دھیمے بہاؤ کی کیفیت ہے۔ ایسی نظموں میں مولانا آزاد اور خضر حیات' خانہ جنگی' قومی اخبار' کوریا کا نعرہ وغیرہ ہیں۔ لیکن کیفی کو جلد ہی ہنگامی شاعری کا احساس ہوگیا اور انہوں نے اس انداز کو ترک کر دیا۔

جان نثار اختر نے بھی اپنی شاعری کا آغاز ہلکی پھلکی نظموں سے کیا۔ ترقی پسند تحریک سے متاثر ہوکر انہوں نے انقلابی نظمیں لکھیں جن میں بگولا' یہ ہوکر رہے گا' میں ان کے گیت گاتا ہوں' سجاد ظہیر کے نام' روس کو سلام وغیرہ شامل ہیں' روس کو سلام میں 34 مصرعے لفظ ہزار ہا سے شروع ہوتے ہیں۔ امن نامہ' ستاروں کی صدا ان کی طویل نظمیں ہیں۔ خاک دل اور خاموش آواز میں انہوں نے اپنی انفرادیت کو پالیا۔ ان کی رباعیات کا مجموعہ'' گھر آنگن'' بھی کافی مقبول ہوا۔ ان کی غزلوں کے مجموعے'' پچھلے پہر'' سے ایک نئی تبدیلی کا احساس ہوا۔

ساحر لدھیانوی کی شاعری میں بے ساختگی اور تغزل ہے۔ ساحر نے متوسط طبقے کے عام تعلیم یافتہ نوجوانوں کو بے حد متاثر کیا۔ ان کے اسلوب میں ایک وضاحت بے ساختگی اور شرینی ہے جو نوجوانوں کو متاثر کرتی ہے۔ ساحر کا مجموعہ کلام سب سے زیادہ پڑھا گیا۔ تاج محل کے علاوہ ''گریز' چکلے' لمحۂ غنیمت' بنگال' فن کار' کل اور آج' ایک تصویر رنگ' جاگیر' لہو ندر دے رہی ہے حیات'' ساحر کی مشہور نظمیں ہیں۔ ساحر نے امن کے موضوع پر ایک طویل نظم'' پرچھائیاں'' لکھی جو اس موضوع پر لکھی گئی سب سے عمدہ نظم سمجھی جاتی ہے۔

مجروح سلطان پوری نے نظم کے بجائے غزل کو اپنایا وہ سب کچھ جو ترقی پسند شعرا نظم کے پیرایہ میں کر رہے تھے مجروح نے غزل میں کہا۔ مجروح کا لب ولہجہ اردو تغزل کا مستند لب ولہجہ ہے جس میں انہوں نے نئی کیفیات کو سمویا ہے۔ مجروح نے بہت کم لکھا لیکن جو بھی لکھا وہ یاد رہ جانے والا ہے۔

ان کے علاوہ فراق گورکھپوری' مطلبی فرید آبادی' اختر انصاری' احمد ندیم قاسمی' قتیل شفائی' اختر الایمان' شاد عارفی' پرویز شاہدی' منیب الرحمٰن' عزیز حامد مدنی' ظہیر کاشمیری کے علاوہ وامق جون پوری' غلام ربانی تاباں' نیاز حیدر' مخمور جالندھری' سلیمان اریب وغیرہ بھی اہم شاعر ہیں۔

ترقی پسند شاعری کے لیے جو ضروری شرطیں طے کی گئیں وہ اس طرح تھیں۔ شاعر غم دوراں کو موضوع بنائے غم جاناں اور غم ذات کو موضوع بنانا رجعت پسندی ہے۔ شاعر انقلاب کی جدوجہد میں بین الاقوامی سیاست پر نظر رکھے۔ اس کا کینویس وسیع ہو۔ جمالیاتی قدریں' ہیت کا تناسب وغیرہ رجعت پسند نقادوں کی اصطلاحیں ہیں۔ ادب میں اشاریت' رمزیت' استعارہ' تشبیہ' علامت زوال پسندوں کا رجحان ہے۔ غم افسردگی' اداسی اور تنہائی کا اظہار ناپسندیدہ ہے۔ شاعری کو امید افزا ہونا چاہیئے جو شاعر عالم گیر عوامی جدوجہد کو موضوع نہیں بناتا اس کا سیاسی شعور خام ہے۔

اس فارمولے کے زیر اثر جو شاعری کی گئی وہ یکسانیت کا شکار ہوگئی۔ دنیا کے ہر ملک کو موضوع بنایا گیا۔ نظموں میں لفظوں کی تکرار، مصنوعی رجائیت، احساس اور جذبے کے فقدان نے شاعری کو ہنگامی بنادیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس طرح کی شاعری سے لوگ اوب گئے۔

اپنی معلومات کی جانچ

1. ''نوجوانوں سے خطاب، طالب علموں سے خطاب، سپاہی سے خطاب، مزدوروں سے خطاب، کسانوں سے خطاب اب بند ہونا چاہیے'' کس نے کہا؟

(ا) رشید احمد صدیقی (ب) اثر لکھنوی (ج) سجاد ظہیر (د) سردار جعفری

2. مجاز انقلاب کا ڈھنڈورچی نہیں انقلاب کا مطرب ہے'' کس کا قول ہے؟

(ا) آل احمد سرور (ب) خلیل الرحمٰن اعظمی (ج) عزیز احمد (د) فیض احمد فیض

3. ترقی پسند شاعروں میں کس شاعر نے صرف غزل کو اپنے اظہار کا وسیلہ بنایا؟

(ا) مجروح سلطان پوری (ب) ساحر لدھیانوی (ج) کیفی اعظمی (د) مخدوم محی الدین

27.7 افسانہ

ترقی پسند تحریک سے قبل افسانے میں دو واضح میلانات ملتے ہیں۔ ایک حقیقت نگاری اور دوسری رومانیت اور تخیل پرستی کا۔ 1932ء میں ''انگارے'' کے نام سے جو افسانے لکھے گئے ان میں وہ سارے امکانات تھے جو آگے چل کر اردو افسانے کے واضح رجحانات بنے۔ قدیم معاشرے اور اخلاق و قوانین کے خلاف بغاوت کے علاوہ نفسیاتی مسائل کو بھی پہلی بار برتا گیا تھا۔ اس کے لکھنے والے ترقی پسند تحریک کے بانیوں میں سے تھے۔ ترقی پسند افسانہ نگاروں نے انگارے کی توسیع کی۔

1936ء کے بعد اردو افسانہ نگاروں کی جو کھیپ سامنے آئی اس میں کرشن چندر کو سب سے زیادہ مقبولیت حاصل ہوئی۔ کرشن چندر نے ابتدا میں رومانی افسانے لکھے لیکن یہ رومانیت فراریت نہیں بلکہ زندگی کو بدلنے کی آواز ہے۔ ان کے ابتدائی افسانوں میں ''جہلم میں ناؤ پر'' آنگی، جنت و جہنم'' وغیرہ ہیں۔ ''دو فرلانگ لمبی سڑک'' سے وہ سماجی حقیقت نگاری کی طرف آئے۔ کرشن چندر کو کشمیر سے خاص دلچسپی تھی۔ کرشن چندر نے ہیت کے تجربے بھی کیے۔ ''زندگی کے موڑ پر'' گرجن کی ایک شام اور بالکونی'' ان کے طویل افسانے ہیں۔ قحط بنگال پر انہوں نے ناقابلِ فراموش افسانہ ''ان داتا'' لکھا۔ کرشن چندر بعد میں بسیار نویسی کا شکار ہوگئے۔ ان کی افسانہ نگاری پر انشائیے کا رنگ حاوی ہونے لگا۔ اس کے باوجود انہوں نے ''آدھے گھنٹے کا خدا، تائی ایسری، کالو بھنگی، شہزادہ، اشوک کی موت، پورے چاند کی رات'' جیسے افسانے لکھے۔ کرشن چندر کے افسانے ادب عالیہ کا حصہ رہیں گے۔

سعادت حسن منٹو نے تلخ حقیقتوں، عورت مرد کے تعلقات اور ان کی نفسیاتی پیچیدگیوں کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا۔ انہوں نے ابتدا میں سیاسی موضوعات پر افسانے لکھے جن میں کامیاب افسانہ ''نیا قانون'' ہے۔ منٹو کو بمبئی میں بسنے والے نچلے طبقے پر لکھے گئے افسانوں سے شہرت ملی۔ جسم فروش عورتوں پر منٹو نے بے مثال کہانیاں لکھیں ''کالی شلوار، ہتک، جانکی، سوکینڈل پاور بلب، سرکنڈوں کے پیچھے اس موضوع پر لکھی ہوئی کامیاب کہانیاں ہیں۔ منٹو نے اردو افسانے کو بہترین کردار دیے۔ کرداروں پر مبنی افسانوں میں بابو گوپی ناتھ، سہائے، سوگندھی، موذیل، ایشر سنگھ، مد بھائی ٹوبہ ٹیک سنگھ، تقی کاتب، جانکی، راج کشور اور باسط غیر معمولی کردار ہیں۔ منٹو نے فسادات پر بھی یادگار افسانے لکھے۔ منٹو کا اسلوب کفایت شعارانہ اور طریقہ کار سلیقہ مندانہ تھا۔ وہ فطرت انسانی کے رمز شناس اور اعمال انسانی کے پراسرار نفسیاتی محرکات کے نباض تھے۔ منٹو کے افسانوں کا انجام غیر متوقع اور تعجب خیز ہوتا تھا۔

راجندر سنگھ بیدی نے بہت کم لکھا لیکن فنی اعتبار سے مکمل افسانے لکھے۔ مواد' ہیت اور کردار نگاری کے سلسلے میں ان کے ہاں ایک خاص توازن پایا جاتا ہے۔ ان کے افسانوں میں فلسفیانہ فکر اور نفسیاتی باریک بینی ملتی ہے۔ بیدی نے متوسط طبقے کے مسائل اور ان کے دکھ درد سے اچھی طرح واقف ہیں۔ انہوں نے کئی خوب صورت افسانے لکھے۔ دس منٹ بارش میں' گرم کوٹ' ہڈیاں اور پھول' من کی من میں' رحمٰن کے جوتے اور آلو وغیرہ۔ بیدی نے کسی خاص فارمولے پر افسانے نہیں لکھے۔ انسانی جبلی معصومیت ان کا بنیادی موضوع ہے۔ بیدی کے افسانوں میں کردار نگاری کے عمدہ نمونے ملتے ہیں۔ گرہن' لاجونتی' اپنے دکھ مجھے دے دو' اغوا' دیوالہ' لمبی لڑکی کے کرداروں کا دیو مالائی داستانوں سے گہرا تعلق ہے۔ بھولا جیسا بچہ بھی ان کے کرداروں میں شامل ہے۔ بیدی نے شعور کی پختگی اور گہری بصیرت کے ساتھ جنسی موضوعات کو برتا ہے۔ بیدی رمزیت' تہہ داری اور مشکل پسندی کے قائل تھے۔

عصمت چغتائی نے متوسط طبقے کی عورتوں کی زندگی اور ان کے نفسیاتی مطالعے کو اپنی افسانہ نگاری کا محور بنایا۔ وہ عورت کی نفسیاتی نشوونما اور اس کے پیچ وخم کو بڑی مہارت کے ساتھ پیش کرتی ہیں۔ اس میں رمزیت اور طنزیہ انداز ہوتا ہے۔ گیندا' اُف یہ بچے' ساس' جوانی' ایک شوہر کی خاطر قابل ذکر ہیں۔ جنسی موضوعات پر بھی انہوں نے سنبھل کر لکھا لیکن 'لحاف' کی وجہ سے کافی بدنام ہوئیں۔ حقائق کی پیش کشی کے لحاظ سے پردے کے پیچھے' کیڈل کورٹ' قابل ذکر ہیں۔ ان کا جو نقطہ نظر تھا وہ دو ہاتھ' بے کار' عشق پر زور نہیں اور گلدان میں واضح انداز میں ملتا ہے۔ ''چوتھی کا جوڑا'' ان کا یادگار افسانہ ہے۔ اس کے علاوہ پنکچر' یار' نفرت' بیمار' خدمت گزار قابل ذکر ہیں۔ عصمت چغتائی کا سب سے بڑا وصف ان کا اسلوب ہے جس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے خلیل الرحمٰن اعظمی لکھتے ہیں'' ان کے افسانوں سے اردو افسانوں کی لغت میں بے شمار نئے الفاظ' نئے محاورات' نئی تشبیہات اور علامات کا اضافہ ہوا ہے جو محض عورتوں کی معاشرت سے تعلق رکھتے ہیں''۔

ان چار افسانہ نگاروں کے علاوہ حیات اللہ انصاری' سہیل عظیم آبادی' اوپیندر ناتھ اشک' اختر حسین رائے پوری' اختر اورینوی' اختر انصاری' احمد ندیم قاسمی' دیوندر ستیارتھی' بلونت سنگھ' خواجہ احمد عباس' مہیندر ناتھ' ابراہیم جلیس' ہاجرہ مسرور' خدیجہ مستور' شکیلہ اختر' صدیقہ بیگم سیوہاروی وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

ترقی پسند تحریک میں اردو افسانے نے عالمی معیار تک رسائی حاصل کی۔ عورتوں کے مسائل' فسادات' بین الاقوامی مسائل اور نفسیاتی کردار نگاری' ترقی پسند افسانے کے خاص اوصاف رہے ہیں۔

اپنی معلومات کی جانچ

1. بمبئی میں بسنے والے نچلے طبقے' جسم فروش عورتوں اور دلالوں پر کس نے بے مثال کہانیاں لکھیں؟

(ا) کرشن چندر (ب) راجندر سنگھ بیدی (ج) عصمت چغتائی (د) سعادت حسن منٹو

2. عورتوں کی معاشرت سے تعلق رکھنے والے محاورات' تشبیہات و الفاظ سے کس افسانہ نگار نے اردو افسانے کو مالا مال کیا؟

(ا) صدیقہ بیگم سیوہاروی (ب) عصمت چغتائی (ج) شکیلہ اختر (د) ہاجرہ مسرور

3. قحط بنگال پر کرشن چندر نے جو نا قابل فراموش افسانہ لکھا اس کا نام کیا ہے؟

(ا) بالکونی (ب) زندگی کے موڑ پر (ج) آدھے گھنٹے کا خدا (د) ان داتا

27.8 ناول

ترقی پسند تحریک میں ناول اس درجے کے نہیں لکھے گئے جس معیار کی شاعری یا افسانہ نگاری کی گئی۔ ترقی پسند تحریک امراؤ جان ادا یا گئودان جیسے بڑے ناول پیش نہ کر سکی۔

ترقی پسند ناول کا نقشِ اول سجاد ظہیر کا ''لندن کی ایک رات'' ہے۔ یہ ناول 1936ء میں لکھا گیا مگر اس کی اشاعت 1938ء میں عمل میں آئی۔ سجاد ظہیر نے یہ ناول سے متاثر ہو کر لکھا تھا۔ 16 جون 1904ء کی صبح آٹھ بجے سے شروع ہوتا ہے اور دوسری صبح دو بجے ختم ہوتا ہے۔ ''لندن کی ایک رات'' شام کو چھ بج کر دس منٹ پر شروع ہوتا ہے اور صبح کی پھیکی روشنی پر ختم ہوتا ہے۔ اس ناول میں ان ہندوستانی طلبا کی ذہنی و جذباتی کشمکش کی عکاسی کی گئی ہے جو برطانوی حکومت کے دور میں بغرض تعلیم جاتے تھے۔ سجاد ظہیر نے مختلف کرداروں کے ذریعہ ہندوستان کے متوسط طبقے کے تعلیم یافتہ نوجوانوں کی عکاسی کی ہے اور اس دور کے سیاسی و تہذیبی مسائل کو اپنا موضوع بنایا ہے۔

کرشن چندر کا ناول ''شکست'' 1943ء میں شائع ہوا۔ اس ناول میں کرشن چندر نے برہمنی سماج کے خلاف احتجاج کیا ہے۔ معاشی اور طبقاتی نظام میں محبت کی ناکامی اس ناول کا موضوع ہے۔ کرشن چندر نے معاشی کشمکش فرسودہ رسوم و عقائد اور ذات پات کے بندھنوں کی عمدہ عکاسی کی ہے۔

اس دور کے سب سے کامیاب ناول نگار عزیز احمد ہیں۔ انہیں ناول نگاری کے فن پر پوری گرفت حاصل تھی۔ ''ہوس'' اور ''مرمر اور خون'' ان کے ابتدائی ناول ہیں۔ ''گریز'' ایسی بلندی ایسی پستی ''آگ'' اور ''شبنم'' ان کے دوسرے ناول ہیں۔ ''گریز'' ایک اہم ناول ہے۔ اس کا کردار بھی متوسط طبقے سے تعلق رکھتا ہے اور آئی۔ سی۔ ایس کا امتحان پاس کرنے کے بعد اسے یوروپ کے مختلف مقامات میں جانے کا موقع ملتا ہے۔ عزیز احمد نے یوروپ کی زندگی اور وہاں کا اخلاقی و تہذیبی انحطاط اور ہندوستان کے بے بس متوسط طبقے کی ذہنیت کی بڑی کامیاب عکاسی کی ہے۔ ''ایسی بلندی ایسی پستی'' میں انہوں نے حیدرآباد کے جاگیردارانہ نظام کی تصویر کشی کی ہے جو زوال پذیر تھا۔ یہ ناول اس دور کی تہذیب کے کھوکھلے پن کو عیاں کرتا ہے۔ ''آگ'' کشمیر کی معاشی کشمکش کے پس منظر میں لکھا گیا اور ''شبنم'' میں یونیورسٹی کے پروفیسروں کی اخلاقی کمزوریوں کی نشان دہی کی گئی ہے۔

عصمت چغتائی کا پہلا ناول 'ضدی' ہے۔ یہ ناول جذباتیت اور رومانیت پر مبنی ہے اور فلم کے تقاضوں کو مدنظر رکھ کر لکھا گیا۔ ان کا اہم ناول ''ٹیڑھی لکیر'' ہے۔ اس ناول میں عصمت نے ایک نسوانی کردار کو پیدائش سے جوانی تک جو مختلف منزلیں پیش آتی ہے انہیں کامیابی کے ساتھ اور ایک قطرۂ خون پیش کیا۔ اس میں مصنفہ کا ذاتی تجربہ اور مشاہدہ چھلکتا ہے۔ یہ ناول ایک کامیاب نفسیاتی ناول ہے۔ عصمت نے معصومہ' عجیب آدمی' جنگلی کبوتر بھی لکھے۔

ابراہیم جلیس نے ''چور بازار'' لکھا۔ سعادت حسن منٹو نے ''بغیر عنوان کے'' لکھا۔ قرۃ العین حیدر نے ''میرے بھی صنم خانے'' (1947ء) اور احسن فاروقی نے ''شام اودھ'' (1948ء) لکھا۔ یہ ناول ترقی پسند ناولوں کے زمرے میں نہیں آتے۔ راجیندر سنگھ بیدی کا ناولٹ ''ایک چادر میلی سی'' ایک اہم ناولٹ ہے۔ حیات اللہ انصاری کا ناول ''لہو کے پھول'' 2608 صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔ اس میں 1911ء سے 1950ء تک کی سماجی' معاشرتی اور سیاسی زندگی کی ترجمانی کی گئی ہے۔ کرشن چندر نے ''جب کھیت جاگے'' جیسا ناول لکھا جس میں کسانوں کی تلنگانہ تحریک کو موضوع بنایا گیا۔ فسادات کے موضوع پر رامانند ساگر کا ناول ''اور انسان مر گیا'' اہم ہے۔ دراصل اچھے ناول ترقی پسند تحریک کے بعد لکھے گئے جن میں خدیجہ مستور کا ''آنگن'' قرۃ العین حیدر کا ''آگ کا دریا'' عبداللہ حسین کا ''اداس نسلیں'' شوکت صدیقی کا ''خدا کی بستی'' شامل ہیں۔

اپنی معلومات کی جانچ

1. عزیز احمد کے کس ناول میں حیدرآباد کے جاگیردارانہ نظام کی تصویر کشی کی گئی ہے؟

(ا) آگ (ب) ایسی بلندی ایسی پستی (ج) شبنم (د) گریز

2. عصمت چغتائی کے کس ناول کو نفسیاتی ناول قرار دیا گیا؟

(ا) ضدی (ب) ٹیڑی لکیر (ج) معصومہ (د) عجیب آدمی

3. راجندر سنگھ بیدی کے ناولٹ کا نام کیا ہے؟

(ا) ایک چادر میلی سی (ب) شام اودھ (ج) آگ کا دریا (د) لہو کے پھول

27.9 تنقید

ترقی پسندوں نے حسن کے معیار کو بدلا اور ادب کو جانچنے اور پرکھنے کے لیے نئے نئے اصول وضع کیے۔ ان کا خیال تھا کہ ادب سماجی زندگی کی پیداوار ہے۔ اس لیے سماجی زندگی کے ساتھ ساتھ اس کا بدلنا بھی ضروری ہے۔ وہ ادب کے تنقید حیات ہونے کے قائل تھے۔ ترقی پسند تحریک کے زیر اثر اردو تنقید کے مزاج اور ذہن میں نئی نئی تبدیلیاں آئیں۔ بحث مباحثے کے لیے راہیں نکلیں' سوچنے سمجھنے کی صلاحیت میں اضافہ ہوا۔ ادب میں مواد' ہیت اور اظہار و اسلوب میں نئے تجربات کی ہمت افزائی کی گئی۔ جن نقادوں نے ترقی پسند تنقید کے اصول وضع کیے اور معترضین کا تسلی بخش جواب دیا۔ ترقی پسند تحریک کے زیر اثر جو نظریاتی مسائل سامنے آئے انہیں سوجھ بوجھ کے ساتھ حل کیا اور اردو تنقید کو واضح' سائنٹفک اور معروضی انداز بخشا ان میں اختر حسین برائے پوری' سجاد ظہیر' ڈاکٹر عبدالعلیم احتشام حسین اور مجنوں گورکھپوری شامل ہیں۔

اختر حسین رائے پوری کا مضمون ''ادب اور زندگی'' (رسالہ اردو۔ جولائی 1995ء) ترقی پسند ادب میں پہلی تنقیدی کوشش ہے۔ اختر حسین رائے پوری نے ادب کا مقصد ذوقِ جمال تفنن طبع اور ہنسی مذاق اور تفریح کو نہیں بلکہ ادب میں افادیت و مقصدیت اور نئی معنویت کو قرار دیا۔ ان کے تنقیدی مضامین کا مجموعہ ''ادب اور انقلاب'' کے نام سے شائع ہوا۔ اختر حسین رائے پوری نے نذر الاسلام کی شاعری کو ترقی پسند ادب کا بہترین نمونہ قرار دیا۔ اختر حسین رائے پوری کی انتہا پسندی نے انہیں بہت دور تک چلنے نہیں دیا۔ وہ ترقی پسند تنقید سے علحدہ ہو گئے۔

سجاد ظہیر مارکسی نظریات کے حامی تھے۔ تنقید پر انہوں نے کوئی باضابطہ کتاب نہیں لکھی لیکن جہاں جہاں ضرورت پڑی انہوں نے اپنے تنقیدی نظریات کا اظہار کیا۔ ایک ایسے وقت جب نوجوان جوش اور نذر الاسلام کے زیر اثر انقلاب کا دہشت ناک خونین تصور پیش کر رہے تھے۔ سجاد ظہیر نے ''اردو کی جدید انقلابی شاعری'' لکھ کر نوجوانوں کو انتہا پسندی سے روکا اور اعتدال کا راستہ اختیار کرنے کی تلقین کی۔ سردار جعفری نے فیض پر سخت تنقید کی تھی۔ وہ رمز و اشاریت کے خلاف تھے۔ انہوں نے فیض کو رجعت پسند شاعر قرار دیا۔ سجاد ظہیر نے فیض کی انفرادیت نرم شیریں مترنم اندازِ کلام کو قرار دیا۔

ڈاکٹر عبدالعلیم کا رویہ سخت اور ایک طرفہ تھا۔ لیکن بعد میں انہوں نے اس کو تبدیل کیا۔ اس تبدیلی کا احساس ان کے مضمون ''ادب اور ماکسزم'' میں ہوتا ہے۔ ڈاکٹر عبدالعلیم عوامی شاعری کا مطالبہ کرتے ہیں۔ وہ ادب میں رمز و ایما کو جائز قرار نہیں دیتے۔

احتشام حسین کو ترقی پسند تنقید میں ممتاز مقام حاصل ہے۔ ان کا رویہ متوازن اور غیر جذباتی' ان کا علم گہرا اور مطالعہ وسیع تھا۔ انہوں نے نظری اور عملی تنقید پر مضامین لکھے۔ تنقیدی جائزے' روایت اور بغاوت' ادب اور سماج' تنقید اور عملی تنقید' ذوق ادب و شعور' تنقیدی نظریات ان کی اہم کتابیں ہیں۔ احتشام حسین کارل مارکس کے جدلیاتی مادیت کے فلسفے سے متاثر تھے۔ وہ ادب کے ذریعہ عوام کو بیدار کرنے کے قائل تھے۔ احتشام حسین جمالیاتی اور ادبی قدروں کو زیادہ اہمیت نہیں دیتے۔ وہ یہ دیکھتے ہیں کہ فن پارہ اشتراکیت سے کتنا قریب ہے اور محنت کش مزدوروں کو اس سے کیا فائدہ حاصل ہو سکتا ہے۔ شعر و ادب پر جتنی بے لاگ باتیں احتشام حسین نے کی ہیں۔ دوسرے مارکسی نقادوں کے یہاں نہیں ملتیں۔

مجنوں گورکھپوری نے ابتدا میں تاثراتی تنقید کی لیکن انقلاب روس کے بعد ان کا زاویہ فکر بدل گیا۔ مجنوں کا خیال تھا کہ ادب صرف زندگی کا ترجمان ہی نہیں بلکہ زندگی کا نقاد بھی ہوتا ہے۔ مجنوں کے یہاں ادب میں اجتماعیت و انفرادیت ماضی کے ادبی اکتسابات کے سلسلے میں صحت مند رویہ' ہنگامی ادب کی نوعیت فن اور رمز و ایما کی ضرورت پر ایک متوازن اور سلجھا ہوا انداز فکر ملتا ہے۔ مجنوں نے عملی تنقید کا اظہار بہت کم کیا۔

آل احمد سرور نے خود کو کسی خاص دبستاں یا گروہ سے وابستہ نہیں کیا۔ آل احمد سرور مارکسی نظریہ سے متاثر نظر آتے ہیں۔ ترقی پسندانہ

رجحانات کی خوبی بیان کرنے ادب کے افادی' مقصدی' عوامی اور اجتماعی کردار پر زور دینے کے باوجود وہ دوسرے مارکسی نقادوں کی طرح پہلے سے طے شدہ نظریے کی روشنی میں ادب کو جانچنے اور پرکھنے کی کوشش نہیں کرتے۔ آل احمد سرور کے یہاں ذہنی توازن فکری بصیرت اور فنی رمز شناسی کا جوہر یکجا ہوگیا ہے۔ تنقید سے اشارے' نئے اور پرانے چراغ' تنقید کیا ہے۔ نظر اور نظریے ان کی اہم تصانیف ہیں۔

عزیز احمد نے ترقی پسند ادب کو ایک متوازن نقطۂ نظر دیا۔ انہوں نے ترقی پسند ادیبوں اور شاعروں کو انتہا پسندی کا شکار ہونے سے بچالیا۔ وہ ادب کو زندگی کا ترجمان سمجھتے تھے۔ وہ پرانے ادب کو رد نہیں کرتے بلکہ پرانے ادب میں ترقی پسند عناصر تلاش کرتے ہیں۔ ''ترقی پسند ادب'' ان کی اہم کتاب ہے۔

ممتاز حسین ادب کے مارکسی نقطۂ نظر کے حامی تھے۔ انہوں نے سماجی زندگی کو اس کے تاریخی ارتقا کی روشنی میں دیکھنے کی کوشش کی اور مارکسی نظریۂ تنقید کو جامعیت کے ساتھ پیش کیا۔ ابتدا میں ممتاز حسین کا انداز بیان مشکل اور پیچیدہ تھا بعد میں انہوں نے اس پر قابو پالیا۔ ان کا مضمون ''ماضی کے ادب عالیہ سے متعلق'' بہت ہی اہم ہے۔ اس میں انہوں نے مارکسی نقطۂ نظر کی بڑی خوبی سے وضاحت کی ہے۔

علی سردار جعفری خود کو نقادوں کی صف میں شامل نہیں کرتے لیکن انہوں نے اپنی تنقید سے بھی متاثر کیا۔ سردار جعفری نے کبیر' میر' غالب' اقبال اور مخدوم کے کلام کا جائزہ لیتے ہوئے اس دور کے سماجی و سیاسی حالات' تہذیب و تمدن' طبقاتی کشمکش اور عوامی زندگی سے ان کے گہرے رشتے کو اہمیت دی۔ ان کی اہم کتاب ''ترقی پسند ادب'' ہے۔ علی سردار جعفری ایسی شاعری کو ترقی پسندی کے دائرے سے خارج قرار دیتے ہیں جس میں رمزیت' اشاریت' تشبیہہ و استعارہ اور تہہ داری ہو۔ اسی نقطۂ نظر کی وجہ سے انہوں نے فیض کی نظم ''صبح آزادی'' پر سخت تنقید کی۔ اسی طرح انہوں نے منٹو پر بھی سخت تنقید کی تھی۔ انہوں نے فیض اور جذبی کے مقابلے میں کیفی اعظمی اور جان نثار اختر وغیرہ کی شاعری کی تعریف کی۔ علی سردار جعفری کی تنقید نے لکھنے والوں کو تذبذب میں مبتلا کردیا۔

محمد حسن نے بھی مارکسی نقطۂ نظر سے ادب کو جانچنے اور پرکھنے کی کوشش کی۔ محمد حسن ادب کی عصریت' انفرادیت اور آفاقیت کو تسلیم کرتے ہیں۔ وہ تنقید کے لیے سائنٹفک طریقوں کو ضروری سمجھتے ہیں۔ وہ جمالیات اور فکر کے درمیان توازن قائم رکھنے کے قائل ہیں۔ انہوں نے اپنی تنقید کو غیر جانب دار بنانے کی کوشش کی۔ شعر نو' عرض ہنر' ادبی سماجیات' شناسا چہرے' معاصر ادب کے پیش رو' جدید اردو ادب اور دہلی میں اردو شاعری کا فکری و تہذیبی پس منظر ان کی اہم تصانیف ہیں۔

قمر رئیس نے زیادہ تر فکشن پر لکھا۔ انہوں نے مارکسی نظریے کا اطلاق فن پارے پر بڑی ہنرمندی سے کیا۔ وہ سماجی عوامل کے ساتھ ساتھ داخلی محرکات اور فنی خوبیوں پر بھی نظر رکھتے ہیں۔ وہ ادب اور سماج کے گہرے رشتے کو تسلیم کرتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ ناولوں میں ہم عصر حالات' تہذیب' معاشرت' سماجی' سیاسی اور اقتصادی حالات کا جتنا اچھا اور مفصل بیان ہوتا ہے اردو کی دوسری صنف اس کی متحمل نہیں ہوسکتی۔ تلاش و توازن اور تنقیدی تناظر ان کی اہم کتابیں ہیں۔

سید محمد عقیل رضوی بنیادی طور پر سماجی اثرات کو اہمیت دیتے ہیں لیکن اس کے ساتھ جدید حسیت اور زندگی کے اس کرب پر بھی نگاہ رکھتے ہیں جس نے ادب میں پرانے اصولوں کو توڑا۔ وہ جدیدیت کے سخت مخالف ہیں۔ وہ اپنے مضمون ''جدید قدر اور نظر'' میں لکھتے ہیں :

> ''ادب میں فن کار کی ذات اور اس کے انفرادی احساسات کا اظہار ضرور ہوتا ہے لیکن اس کا شعور جماعتی شعور ہے۔ اس طرح اس کو روح عصر سے الگ نہیں پیش کیا جاسکتا ہے اور روح عصر سے جدلیت تک راستہ جاتا ہے''۔

ان نقادوں کے علاوہ اختر انصاری' احمد ندیم قاسمی' عبادت بریلوی' وقار عظیم' اعجاز حسین' اختر اورینوی' اسلوب احمد انصاری' خورشید الاسلام'

ظ۔انصاری، شکیل الرحمٰن، باقر مہدی، وحید اختر، ہنس راج رہبر، عالم خوندمیری، عتیق اللہ، صادق وغیرہ نے بھی اپنی تحریروں میں ترقی پسند نظری و عملی تنقید کا احاطہ کیا۔

ترقی پسند تحریک میں ڈراما بھی لکھا گیا اور طنز و مزاح بھی۔ سجاد ظہیر نے اپنے لندن میں قیام کے دوران ڈراما ''بیمار'' لکھا تھا۔ رشید جہاں نے ''عورت''، محمود الظفر نے ''ایک شام'' لکھا۔ احمد علی نے ''آزادی'' لکھا۔ ڈاکٹر دین محمد تاثیر نے ''مرزا غالب کے گھر ایک شام'' لکھا۔ کرشن چندر نے ریڈیو کی ملازمت کے دوران ریڈیائی ڈرامے لکھے جو ''دروازہ'' کے نام سے مجموعے کی شکل میں شائع ہو چکے ہیں۔ اس میں ''سرائے کے باہر'' زیادہ مقبول ہوا۔ منٹو کے ڈراموں کے مجموعے ''تین عورتیں'' اور ''آؤ'' عصمت چغتائی کے ڈراموں کا مجموعہ ''شیطان'' کے نام سے راجندر سنگھ بیدی کے ریڈیائی ڈراموں کا مجموعہ ''سات کھیل'' شائع ہو چکے ہیں۔ اوپیندر ناتھ اشک نے بے شمار ڈرامے لکھے اور ایک ایکٹ کے ڈراموں کو مرزا ادیب نے مقبول بنایا۔ ڈاکٹر محمد حسن کے ڈراموں کا مجموعہ پیسہ اور پرچھائیں'' ہے۔ ریوتی سرن شرما اور حبیب تنویر نے ڈرامے کی صنف کو اپنایا۔ حبیب تنویر کا ڈراما آگرہ بازار کافی مقبول ہوا۔

طنز و مزاح میں کنھیالال کپور، کرشن چندر، ابراہیم جلیس اور فکر تونسوی نے گہرے نقش چھوڑے۔ کرشن چندر کا ناول ''ایک گدھے کی سرگذشت'' بہت مقبول ہوا۔

اپنی معلومات کی جانچ

1. ترقی پسند تنقید میں کس کو نمایاں مقام حاصل ہے؟

(ا) اختر حسین رائے پوری (ب) مجنوں گورکھپوری (ج) احتشام حسین (د) عزیز احمد

2. رمزیت، اشاریت، تشبیہ و استعارہ اور تہہ داری کی مخالفت کس نے کی۔

(ا) سردار جعفری (ب) ممتاز حسین (ج) مجنوں گورکھپوری (د) سجاد ظہیر

3. قمر رئیس نے زیادہ تر کس صنف پر لکھا۔

(ا) ڈراما (ب) ناول و افسانہ (ج) غزل (د) مرثیہ

27.9 خلاصہ

1934ء میں لندن میں زیر تعلیم نوجوانوں کے ایک گروہ نے انڈین پروگریسیو رائٹرز ایسوسی ایشن بنائی۔ یہ نوجوان سجاد ظہیر، ملک راج آنند، جیوتی گھوش، پرمود سین گپتا اور دین محمد تاثیر تھے۔ انہوں نے ایک مینی فیسٹو بنایا اور اپنے دوستوں کو ہندوستان بھیجا۔ پریم چند نے اپنے رسالے ''ہنس'' میں یہ مینی فیسٹو شائع کیا۔ 1945ء میں سجاد ظہیر ہندوستان آئے تو انہوں نے ترقی پسندوں کا ایک حلقہ بنالیا۔ ترقی پسند مصنفین کی پہلی کانفرنس اپریل 1936ء میں لکھنو میں ہوئی۔ اس کانفرنس میں پریم چند نے یادگار خطبہ دیا۔ ایک اعلان نامہ جاری کیا گیا جس میں تلقین کی گئی کہ بے بنیاد روحانیت اور تصویر پرستی چھوڑ کر عقلیت اختیار کریں۔ پریم چند نے اپنے خطبے میں حسن کا معیار بدلنے پر زور دیا۔ تفکر، آزادی کے جذبے، تعمیر کی روح اور زندگی کی حقیقتوں، حرکت، ہنگامہ اور بے چینی پیدا کرنے والے ادب پر اصرار کیا۔ ہندوستان کی دوسری زبانوں میں بھی انجمنیں قائم ہونے لگیں۔ 1938ء میں دوسری کل ہند کانفرنس کلکتے میں بلائی گئی۔ دو ڈھائی سال کے اندر ترقی پسند ادیبوں کی تحریک تمام ہندوستانی زبانوں میں مقبول ہوگئی۔ ترقی پسندوں نے اپنا رسالہ ''نیا ادب'' لکھنؤ سے جاری کیا۔ ملک راج آنند، ڈاکٹر عبدالعلیم اور احمد علی کی ادارت میں ماہنامہ ''انڈین لٹریچر'' شائع ہوا۔ تیسری کل ہند کانفرنس مئی 1942ء میں دہلی میں منعقد ہوئی اس میں ایک قرار داد پاس کی گئی کہ وہ فاشزم کے خلاف ہیں اور اتحادی اقوام کے ساتھ ہیں۔ برطانوی سامراج کے اس رویے کی گئی مذمت کی کہ وہ نازک حالات میں بھی ہندوستان کو آزادی دینے کے لیے تیار

نہیں۔ چار پانچ سال میں جس طرح کا ادب لکھا گیا اس کی تعریف تو ہوئی لیکن تنقید بھی ہونے لگی۔ آزاد نظم کی سخت مخالفت کی گئی اور فحاشی کا الزام عاید کیا گیا۔ اکتوبر 1945ء میں حیدرآباد میں ترقی پسند مصنفین نے ایک کانفرنس بلائی۔ فحاشی کے خلاف قرارداد پیش کی گئی لیکن قاضی عبدالغفار اور مولانا حسرت موہانی نے اس کی مخالفت کی' یہ قرارداد مسترد ہوگئی۔ ڈسمبر 1947ء میں لکھنو میں ایک کانفرنس بلائی گئی جس میں طے ہوا کہ بمبئی میں باقاعدہ دفتر قائم کیا جائے۔ مئی 1949ء میں پانچویں کل ہند کانفرنس بھیمڑی میں منعقد کی گئی۔ ایک نیا مینی فیسٹو بنایا گیا۔ ہندی کے مشہور نقاد رام بلاس شرما کو جنرل سکریٹری منتخب کیا گیا۔ نئے منشور کی اشاعت کی وجہ سے لکھنے والے تذبذب میں پڑ گئے۔ مارچ 1952ء میں دہلی میں کانفرنس منعقد کی گئی۔ اس کانفرنس میں کرشن چندر کو کل ہند انجمن کا سکریٹری چنا گیا۔ اس دوران سجاد ظہیر راول پنڈی کیس سے رہا ہو کر مستقل طور پر ہندوستان آ گئے۔ مئی 1956ء میں حیدرآباد میں کل ہند کانفرنس ہوئی۔ اس میں فیصلہ کیا گیا کہ ترقی پسند تحریک اپنا رول ادا کر چکی۔ اب اس کی مزید تنظیم ضروری نہیں۔

ترقی پسند شاعروں میں اسرار الحق مجاز' فیض احمد فیض' مخدوم محی الدین 'سردار جعفری' کیفی اعظمی' جان نثار اختر' ساحر لدھیانوی' مجروح سلطان پوری نمایاں حیثیت رکھتے ہیں۔ افسانہ نگاروں میں کرشن چندر' سعادت حسن منٹو' راجندر سنگھ بیدی' عصمت چغتائی نمائندہ افسانہ نگار ہیں۔ ان کے علاوہ اپیندر ناتھ اشک' خواجہ احمد عباس' ہاجرہ مسرور' خدیجہ مستورت دیویندر ستیارتھی۔ مہیندر ناتھ' شکیل وغیرہ بھی نمایاں حیثیت رکھتے ہیں۔ ناول نگاروں میں سجاد ظہیر' کرشن چندر' عصمت چغتائی' ابراہیم جلیس' راجندر سنگھ بیدی' حیات اللہ انصاری وغیرہ نے اچھے ناول لکھے۔ تنقید میں سجاد ظہیر' ڈاکٹر عبدالعلیم' اختر حسین رائے پوری' احتشام حسین' مجنوں گورکھپوری' آل احمد سرور' عزیز احمد' ممتاز حسین' قمر رئیس' سید محمد عقیل نے کارہائے نمایاں انجام دیے۔ ترقی پسند مصنفین نے ڈراما اور طنز و مزاح میں بھی گہرے نقوش چھوڑے۔

27.11 نمونہ امتحانی سوالات

مندرجہ ذیل ہر سوال کا جواب تقریباً تیس سطروں میں لکھیے۔

1. ترقی پسند تحریک کا پس منظر کیا ہے۔ تفصیلی نوٹ لکھیے۔
2. ترقی پسند تحریک کے آغاز اور عروج کی تفصیلات تحریر کیجیے۔
3. ترقی پسند تحریک کے زوال کے اسباب کیا ہیں؟

مندرجہ ذیل ہر سوال کا جواب تقریباً پندرہ سطروں میں لکھیے۔

1. ترقی پسند شاعری کے بارے میں اپنی معلومات کا اظہار کیجیے۔
2. ترقی پسند افسانے کو عالمی معیار تک پہنچانے والے افسانہ نگاروں کے بارے میں نوٹ لکھیے۔
3. ترقی پسند تنقید کے اہم خدوخال واضح کیجیے۔

27.12 فرہنگ

اشتراکیت = جائیداد و وسائل میں عوام کی مساویانہ حصہ داری کا فلسفہ

غاصبانہ = زبردستی

مینی فیسٹو = منشور

لائحہ عمل = طریقۂ عمل

عقلیت = دلائل پر مبنی طرز فکر و عمل

مشاورتی = صلاح و مشورہ کا عمل

رجعت پسند = قدامت پسند

بہیمیت = بے رحمی

بدظن ہونا = خفا ہونا

عنفوان شباب = جوانی کی اٹھان

تغزل = غزل کے خمیر کو تغزل کہتے ہیں

27.13 سفارش کردہ کتابیں

1. اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک ..... خلیل الرحمٰن اعظمی
2. ترقی پسند ادب ..... عزیز احمد
3. ترقی پسند ادب ..... علی سردار جعفری
4. روشنائی ..... سجاد ظہیر

☆☆☆

اکائی : 28 حلقہ اربابِ ذوق

ساخت

28.1 تمہید

28.2 حلقۂ اربابِ ذوق: پس منظر، قیام، سرگرمیاں

28.3 حلقۂ اربابِ ذوق: رجحانات

28.4 خلاصہ

28.5 نمونہ امتحانی سوالات

28.6 فرہنگ

28.7 سفارش کردہ کتابیں

28.1 تمہید

یہ اکائی اردو شعر و ادب کے ایک اور نظریاتی ادارہ ''حلقہ اربابِ ذوق'' سے تعلق رکھتی ہے۔ ہم اس اکائی میں آپ کو اُس پس منظر سے واقف کرائیں گے جس کے باعث حلقۂ اربابِ ذوق کا وجود ہوا۔ حلقہ کے قیام اور اس کی سرگرمیوں پر بھی روشنی ڈالی جائے گی اور اسی کے ساتھ حلقۂ اربابِ ذوق کے شعری و ادبی میلانات اور رجحانات پر بھی گفتگو کی جائے گی۔ حلقہ کے امتیازی پہلو بھی زیرِ بحث آئیں گے۔ ہم اس اکائی کا خلاصہ بھی پیش کریں گے۔ آپ اپنی معلومات کی جانچ بھی کریں گے۔ امتحانی سوالات بھی درج کیے گئے ہیں اور آپ کے مزید مطالعہ کے لیے سفارش کردہ کتابوں کی فہرست بھی دی جارہی ہے۔ امید ہے آپ ان سب سے استفادہ کریں گے۔

28.2 حلقۂ اربابِ ذوق: پس منظر، قیام، سرگرمیاں

1935ء کے لگ بھگ بلکہ یوں کہیے کہ بیسویں صدی کی چوتھی دہائی، ہندوستانی معاشرہ میں انتشار، اختلال، افراتفری، پریشانی، بکھراؤ اور خلجان کا زمانہ تھی۔ بیسویں صدی کے آغاز بلکہ اس سے کچھ پہلے بھی دیکھیں تو حالات کچھ اور سمت، کچھ اور موڑ اور کچھ اور رنگ اختیار کرتے جارہے تھے۔ 1830ء کے اس واقعہ کا ہلکا سا تذکرہ ہو جائے کہ راجہ رام موہن رائے، یورپ کے سفر پر روانہ ہوئے تو انھوں نے فرانسیسی جہاز سے جانے پر اصرار کیا کہ وہ فرانسیسی انقلاب سے متاثر تھے۔ پھر 1905ء اور 1917ء میں روسی انقلاب ہوئے۔ بلقان کے ہنگامے بھی اسی زمانے کی بات ہیں جس میں ہندوستانیوں نے ترکوں سے عدم تعاون کیا۔ پہلی جنگِ عظیم کے اثرات ساری دنیا پر ترتیب پائے۔ 1933ء کی بات ہے کہ ہٹلر نے جرمنی میں فاشزم کی تحریک کی سرگردگی کی۔ ہونے والی دوسری جنگ عظیم کے خطرات منڈلانے لگے تھے۔ سیاسی کشمکش کا دور تھا۔ اقتدار کے لیے آویزش افزوں ہوتی جارہی تھی۔ بڑی طاقتیں دنیا کے زیادہ سے زیادہ حصہ کو اپنی گرفت میں رکھنے کے جنون میں تھیں، بین الاقوامی بحران شدت اختیار کرتا جارہا تھا اور اسلحہ کی دوڑ نے ترقی یافتہ ممالک کو دیوانہ بنا رکھا تھا۔ ادیبوں، شاعروں اور فن کاروں نے آواز بلند کی۔ یورپ کے روشن خیال اور ترقی پسند حلقوں میں فاشزم کے خلاف ردِ عمل ہوا۔ ہٹلر نے کئی شاعروں، ادیبوں اور سائنس دانوں وغیرہ کو یا تو قتل کرادیا تھا یا جلاوطن۔ ایسے میں 1935ء میں ادیبوں وغیرہ کی کانفرنس ہوئی ہے۔ بعد ازاں لندن میں مقیم ہندوستانی طلبہ جنھوں نے اس کانفرنس میں شرکت کی تھی اپنی کانفرنس کرتے ہیں اور ترقی پسند تحریک کا مینی فیسٹو تیار کیا جاتا ہے۔ یہ طلبہ جب ہندوستان واپس ہوتے ہیں تو لکھنؤ میں ترقی پسند مصنفین کی کانفرنس منعقد ہوتی ہے اور یہ سلسلہ چل نکلتا ہے۔ یہی وہ زمانہ ہے جس میں علم نفسیات کو مقبولیت حاصل ہوتی ہے۔ فرائیڈ اور یونگ کے نظریات عام ہونے لگتے ہیں۔ ترقی پسندوں نے فرد کے جذبات و احساسات کو کم اہمیت دی تھی بلکہ نظر انداز کردیا تھا۔ ترقی پسند مصنفین کو کمیونسٹ پارٹی کی سرپرستی حاصل تھی اور ترقی پسند فنکار، پارٹی پروگرام اور اس کی حکمتِ عملی کو روبہ عمل لانے کے پابند۔

معاشرہ کو اہمیت دی جارہی تھی اور فرد کو معاشرہ کا آلہ کار بنا دیا گیا تھا۔ اس کا ردعمل ہونا لازمی تھا۔ چنانچہ درون کی سیاحت کا رجحان عام ہوا۔ فرد کے جذبات و احساسات کو پہچاننے اور ان کا احترام کرنے پر زور دیا گیا۔ حالات بھی کچھ ایسے ہی موڑ کے متقاضی ہوتے جارہے تھے اور کچھ ترقی پسند تحریک کے ردعمل کے طور پر حلقۂ اربابِ ذوق کا قیام عمل میں آیا۔

''بزم افسانہ گویاں'' کے نام سے پہلے ایک انجمن قائم کی گئی اور جیسا کہ نام سے ظاہر ہے یہ بزم صرف افسانے تک محدود تھی لیکن بعد میں یعنی 29 اپریل 1939ء کو ترقی پسند تحریک کے قیام کے لگ بھگ تین سال بعد نام تبدیل کر کے حلقہ اربابِ ذوق کی تشکیل کی گئی اور قیوم نظر اور یوسف ظفر کے حلقہ میں شامل ہونے کے بعد شاعری اور شاعری کی تنقید کو بھی یہاں جگہ ملی اور اس کے دائرہ کار میں بتدریج توسیع ہوتی گئی۔ ڈرامے نے بھی جگہ پائی۔ معریٰ اور آزاد نظم کو مقام ملنا ہی تھا۔ غزل کو بھی نظر انداز نہیں کیا گیا۔ غرض جلد ہی ایک جامع پیرایہ میں حلقہ اربابِ ذوق نے اپنی سرگرمیوں کو آگے بڑھایا۔ اسی کے ساتھ یہ بات بھی اہمیت رکھتی ہے کہ حلقہ اربابِ ذوق کا قیام چونکہ لاہور میں عمل میں آیا تھا اس لیے اس کو عموماً پنجاب کا حلقہ متصور کیا گیا لیکن جلد ہی یہ غلط فہمی دور ہوگئی اور برصغیر کے دیگر علاقے کے قلم کاروں نے بھی اس میں یا تو شرکت کی یا اپنا تعاون دیا۔ ''بزم افسانہ گویاں'' کے بانی ارکان میں شیر محمد اختر، تابش صدیقی اور نصیر احمد وغیرہ تھے لیکن پھر میراجی، ممتاز مفتی، مختار صدیقی اور دیگر نے بھی اس میں شمولیت اختیار کر لی۔ ایک بات کی وضاحت ضروری ہے کہ میراجی نے بعد میں حلقہ اربابِ ذوق کی رکنیت لی۔ حلقہ کے ریکارڈ کے مطابق میراجی نے سب سے پہلے 25 اگست 1940ء کو حلقہ کے جلسہ میں شرکت کی لیکن چونکہ میراجی کی وجہ سے حلقہ کو ایک واضح ادبی رجحان ملا اور اس کی کشش کا باعث وہی ہوئے اس لیے حلقہ اربابِ ذوق کا نام لیتے ہی میراجی کا نام آ جاتا ہے۔ ہر چند کہ اس کے ارکان میں بیدی، ہنس راج رہبر، کنہیالال کپور، پرکاش پنڈت اور بیگم سکینہ محمود کے نام بھی ہیں اور دہلی میں اس کی جو شاخ قائم ہوئی اس کے معتمد ڈاکٹر عبادت بریلوی ہوئے۔ بعد ازاں دھیرے دھیرے خاص طور پر شمالی ہند کے کئی علاقوں میں حلقہ کو وسعت حاصل ہوتی گئی۔ حلقہ کے ارکان کی ہمیشہ یہ مساعی رہی کہ حلقہ کے مقاصد میں توسیع کی جائے اور ارکان کی تعداد میں اضافہ ہو۔

حلقہ کا اہم مسئلہ جلسوں کے لیے مقام کا حصول تھا۔ ابتداً یہ جلسے ارکانِ حلقہ کی رہائش گاہوں پر ہوا کرتے تھے۔ چنانچہ پہلا جلسہ نصیر احمد جامعی کی رہائش گاہ عقب لکشمی منشن پر منعقد ہوا۔ پھر یہ جلسے کبھی بدرالزماں کے دفتر پر ہوئے جو امپورٹ، اکسپورٹ کا کاروبار کرتے تھے اور کبھی مصری شاہ میں واقع تابش صدیقی کے مکان پر۔ 1944ء میں کہیں یہ طے کیا گیا کہ یہاں وہاں جلسے کرنے کی بجائے وائی۔ ایم۔ سی۔ اے میں جلسے ہوا کریں۔ یہ سلسلہ تادیر چلتا رہا۔

حلقۂ اربابِ ذوق نے صرف ادبی اجتماعات ہی کا انعقاد نہیں کیا بلکہ عملی طور پر بھی شعر و ادب کے فروغ میں اپنا حصہ ادا کرنے کی کوشش کی۔ اس رجحان کو آگے بڑھانے کے لیے میراجی کے غیر معمولی حصہ کو سب ہی تسلیم کرتے ہیں۔ چنانچہ 1941ء کی بہترین نظموں کا انتخاب کیا گیا اور اس کی اشاعت عمل میں آئی۔ اس انتخاب میں (24) نظمیں ہیں جو احمد ندیم قاسمی، فیض احمد فیض، مختار صدیقی، ن۔ م۔ راشد، جوش، عدم، اختر شیرانی، سلام مچھلی شہری، شاد عارفی، میراجی، اختر الایمان اور راجہ مہدی علی خاں جیسے فن کاروں کے زورِ قلم کا نتیجہ ہیں۔ احمد ندیم قاسمی اور فیض جیسے شاعروں کی شمولیت اس امر کی غماز ہے کہ حلقہ نے ابھی ایسی صورت نہیں لی تھی اور ترقی پسندوں اور حلقہ کے افراد کے درمیان کوئی خطِ فاصل ظاہر نہیں ہوا تھا۔ اس انتخاب کا ابتدائیہ (پیش لفظ) میراجی نے لکھا تھا میراجی کے باعث حلقہ کے رنگ روپ میں فرق ضرور آیا لیکن بنیادی طور پر جیسا کہ یونس جاوید نے لکھا ہے: ''1941ء تا 1947ء تک حلقۂ اربابِ ذوق کی مجالس میں کوئی نمایاں تبدیلی نہ ہوئی نہ مباحث کے رنگ بدلے نہ ہی تنقید میں کوئی نقطۂ نظر واضح ہو کر سامنے آ سکا۔ البتہ 1941ء تا 1949ء تک کی بہترین نظمیں'' کے عنوان سے منتخب نظموں کے جو مجموعے شائع کیے گئے ان میں ہم حلقہ سے منسلک ادیبوں کی فنی بصیرت اور شعری ادراک کا عکس ضرور دیکھتے ہیں۔ ابتدا میں حلقہ ان شعری انتخابات کو اپنے طور پر ہی شائع کرتا تھا اور ناشر اس طرف متوجہ نہیں ہوتے تھے کہ نئی نظم ابھی تک ان کے ہاں اعتبار نہیں پائی تھی لیکن ''1943ء کی بہترین نظمیں'' کو مکتبہ اردو نے شائع کیا۔ گویا اب وہ بھی نئی نظم کی توانائی، تازگی اور مقبولیت سے متاثر ہو چکے تھے۔ نئی نظم کی مقبولیت اور حلقہ کے بڑھتے ہوئے اثر کا اندازہ یوں لگایا جا سکتا ہے کہ ناشروں نے حلقہ سے پانچ سال تک کے انتخابات شائع کرنے کا معاہدہ کر لیا اور مشمولات کے تعلق سے ناشروں کے اعتراضات اور تجاویز کو ملحوظ رکھتے ہوئے انتخابات کی اشاعت عمل میں آنے لگی۔ تقسیم ہند کا وقت قریب آ رہا تھا، شمالی ہند میں فسادات شروع ہو چکے تھے اس کا اثر حلقہ کے جلسوں اور شرکا کی تعداد پر بھی پڑا۔ چنانچہ مارچ 1947ء میں منعقدہ جلسے میں وحید قریشی، یزدانی ملک اور حفیظ ہوشیار پوری نے جن کو اس جلسہ میں مضامین پڑھنے تھے اس لیے شرکت نہیں کی کہ لاہور میں فسادات کی وجہ سے

حالات اچھے نہیں تھے۔ اس کے بعد بھی دو' تین جلسے فرقہ وارانہ فسادات اور ناگزیر حالات کی بنا پر منعقد نہیں ہو سکے۔ فسادات کے بعد پہلا جلسہ 14 ستمبر 1947ء کو منعقد ہوتا ہے اور پھر یہ سلسلہ چل نکلا۔ بعد ازاں 3 نومبر 1949ء کو میرا جی کے انتقال نے حلقہ کے موقف' اس کے استحکام اور امیج کو نقصان پہنچایا۔ یوں بھی تقسیم ہند کے بعد بدلے ہوئے حالات میں حلقہ کو اپنا توازن برقرار رکھنا دشوار تھا۔ بہترین نظموں کا ہر سال جو انتخاب شائع ہوتا تھا' اس سلسلے میں 1949ء کی بہترین نظموں کا انتخاب شائع ہوا جو میرا جی کے انتقال کے بعد پہلا اور اس سلسلے کا آخری انتخاب تھا۔ اس کے بعد نہ تو کوئی ناشر اس کے لیے آمادہ ہوا اور نہ ہی حلقہ اس کے مصارف برداشت کر سکا۔

منتخب نظموں کی اشاعت کا سلسلہ تو مسدود ہو گیا لیکن ادبی ذوق کی تسکین کے لیے حلقہ نے اپنا مرتب کردہ جریدہ ''نئی تحریریں'' شائع کیا جس کی پہلی جلد 1948ء میں کراچی سے اور دوسری جلد 1954ء میں لاہور سے شائع ہوئی۔ حلقہ کے ترجمان ''نئی تحریریں'' کے صرف چار شمارے لاہور سے شائع ہوئے۔ البتہ اس دوران 1956ء میں "1955ء کی بہترین نظمیں'' کی اشاعت عمل میں آئی جس پر حلقہ کا نام تو درج نہیں تھا البتہ اس کے مرتب قیوم نظر تھے۔ حلقہ کا نام نہ ہونے کی اور کوئی وجہ نہیں تھی سوائے اس کے کہ حلقہ میں گروہ بندی کا آغاز ہو چکا تھا۔ اختلافات شدت اختیار کرنے لگے تھے۔ اس کا اظہار یوں ہوا کہ انتظار حسین' عبادت بریلوی' اور سید وقار عظیم کو ان کی ''انتہا پسندانہ سرگرمیوں'' کی بنا پر حلقہ کی رکنیت سے علحدہ کر دیا گیا۔

حلقہ کے جلسوں میں نظموں کے ساتھ افسانے بھی پیش کیے جانے لگے۔ چنانچہ اعجاز حسین بٹالوی نے افسانہ ''گرل فرینڈ'' 27 نومبر 1955ء کے جلسہ میں پیش کیا۔ سعادت حسین منٹو نے بھی 3 ستمبر 1950ء سے کئی جلسوں میں اپنے افسانے سنائے جن پر کھل کر تنقید ہوئی۔ شاہ دولے کا چوہا'' منٹو کا آخری افسانہ تھا جو انہوں نے حلقہ کے 30 مئی 1954ء کے اجلاس میں پڑھا۔ پھر منٹو کے انتقال کے بعد ہی 23 جنوری 1955ء کو حلقہ کا اجلاس ہوا۔ اس مدت میں نہ صرف بہترین نظموں کے انتخابات شائع ہوئے بلکہ ''بہترین شاعری' بہترین افسانے'' اور بہترین مقالے بھی شائع کیے گئے۔ ان سب کے ناشر تھے مکتبہ جدید لاہور۔ ابھی چند سال بھی گزرنے نہیں پائے تھے کہ حلقہ کے اختلافات مزید ابھرے اور 12 مارچ 1972ء کو حلقہ دو حصوں میں منقسم ہو گیا اور جس گروہ نے قطع تعلق کیا اس نے اپنا نام حلقہ اربابِ ذوق (ادبی) رکھا۔ یہ گروہ ادب کو خالص ادب کے حوالے سے جانچتا پرکھتا تھا۔ دوسرا خالص سیاسی نقطہ نظر سے۔ اس طرح ادب اور سیاست ان کی شناخت بن گئی۔ اس کے بعد کے اتوار سے حلقہ اربابِ ذوق (ادبی) کے جلسے پاک ٹی۔ ہاؤس میں منعقد ہونے لگے جن میں 1977ء تک باقاعدگی رہی۔ بعد میں 1979ء تک بے قاعدگی سے چلتے رہے۔ یہی شب و روز تھے کہ 1980ء میں حلقہ ارباب ذوق (پاکستان) شاخ لاہور کا قیام عمل میں آیا جس کے اجلاس 30 مئی 1980ء سے 4 اگست 1980 تک منعقد ہوئے لیکن یہ حلقہ جلد ہی معطل ہو گیا اور مارچ 1982ء میں یہ صورت رہی کہ تین حلقے اپنے جلسے منعقد کرنے لگے۔ حلقۂ اربابِ ذوق لاہور (پاکستان) حلقۂ اربابِ ذوق (سیاسی) اور حلقۂ اربابِ ذوق (قیوم گروپ)۔ ان میں حلقۂ اربابِ ذوق (پاکستان) اور حلقۂ اربابِ ذوق (سیاسی) کو ایک دوسرے میں ضم کرنے کی کوشش اپریل 1983ء میں شروع ہوئی جو کامیاب نہ ہو سکی۔ یہ دونوں حلقے اپنے اپنے اجلاس منعقد کرنے اور ایک دوسرے کو غیر آئینی بھی قرار دیتے رہے آج بھی حلقۂ اربابِ ذوق کسی نہ کسی نام اور رنگ سے موجود ہے اور کئی ہیں۔ ان کی حیثیت آئینی ہے یا نہیں یہ اور بات ہے لیکن یہ بات طے ہے کہ ترقی پسند تحریک کی طرح اس کی سرگرمیاں بھی برائے نام رہ گئی ہیں اور ترقی پسند تحریک ہی کی طرح حلقہ اربابِ ذوق ہماری ادبی تاریخ کا حصہ بن کر رہ گیا ہے۔

اپنی معلومات کی جانچ

1. حلقۂ اربابِ ذوق کا قیام کب عمل میں آیا اور کہاں؟
2. حلقۂ کے ابتدائی ارکان کے نام لکھیے۔
3. میرا جی سے حلقۂ اربابِ ذوق کا کیسا تعلق رہا؟

28.3 حلقۂ اربابِ ذوق: رجحانات

بیسویں صدی کے آغاز ہی سے ہمارا قومی ہی نہیں' سیاسی' معاشرتی اور ادبی منظر نامہ بدل رہا تھا۔ حتیٰ کہ بیسویں صدی کی چوتھی دہائی کے آتے آتے یہ پوری طرح واضح اور روشن تر ہو گیا۔ ترقی پسند تحریک کا آغاز ہونا ہی تھا سو ہوا اور اس کے ردِ عمل کے طور پر حلقۂ اربابِ ذوق کے قیام پر بھی کسی کو

متعجب ہونے کی ضرورت نہیں۔ وقت بلاشبہ اس موڑ کا متقاضی تھا ترقی پسند تحریک کا آغاز خاصے زور وشور سے ہوا۔ ترقی پسندوں نے ادب برائے زندگی کا نعرہ مخلصانہ طور پر بلند کیا ہوا نہوں نے فرد کے جذبات واحساسات کو نظر انداز نہ بھی کیا ہو بہر کیف ان کو کم اہمیت ضرور دی۔ ویسے نثر اور شاعری سے ایسی مثالیں مل جائیں گی جن میں فرد کے جذبات واحساسات کی دلنواز تصویر کشی اور موثر ترجمانی کی گئی ہے لیکن یہ ترقی پسند تحریک نہیں ہندوستان کے عوامی مزاج اور ہندوستانی زبانوں کے ادب کی صدیوں پرانی روایات کا اثر تھا جو ادیبوں اور شاعروں کے ضمیر اور خمیر میں شامل تھیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ ترقی پسند تحریک ہندوستان کی نئی نسل کے ذہنوں کی نمائندگی کرتی ہو لیکن اس پر پیرس اور لندن کی فضاؤں کا بھی اثر تھا۔ اس پس منظر کے باوجود ترقی پسند تحریک کی یہ زبردست کامیابی تھی کہ اس نے کئی دلوں کو مسخر کر لیا۔ تاہم کئی ذہن ایسے بھی تھے جو اس کو شک وشبہ کی نظر سے دیکھتے تھے۔ ایسے نقاط نظر رکھنے والوں کے نزدیک اظہار ذات' انفرادی جذبات اور احساسات کی ترجمانی' انسانی نفسیات کی تحلیل' واردات قلبی کا انکشاف اور اس کی ترسیل کے بغیر ادب کی تکمیل نہیں ہو سکتی۔ لہذا ایسے فن کار جو ان میلانات کے حامل تھے ترقی پسند تحریک میں ان کو نہ پاتے ہوئے حلقہ ارباب ذوق کے قیام پر مائل ہوئے۔ ترقی پسندوں نے اور ان میں خاص طور پر سردار جعفری اور سجاد ظہیر نے حلقۂ ارباب ذوق کو شدت سے نشانہ بنایا۔ سردار جعفری نے ''ترقی پسند ادب'' میں حلقۂ ارباب ذوق کے ادیبوں کو ہیئت پرست' ابہام پرست اور جنس پرست ادیب قرار دیا جو یورپ کے انحطاطی ادب سے متاثر تھے سجاد ظہیر نے ''روشنائی'' میں ''میراجی'' کو انگلستان کے جدید رجعت پرستوں کا چربہ قرار دیتے ہوئے حلقہ ارباب ذوق کی مجہولیت کا ذکر کیا۔ یہ زاویہ حلقۂ ارباب ذوق کے قابل قبول نہیں رہا۔

حلقۂ ارباب ذوق کو یورپ اور انگلستان سے وابستہ کر دینا درست نہیں۔ خارجی اثرات کی اہمیت مسلم لیکن داخلی محرکات بھی اپنی جگہ اہمیت رکھتے ہیں جس طرح ترقی پسندوں نے روس اور فرانس کے اثرات قبول کیے حلقہ ارباب ذوق والوں نے بھی فرانس اور انگلستان کے اثرات زیادہ قبول کیے۔ ہاں زندگی اور ادب کے بارے میں حلقۂ ارباب ذوق کا رجحان قدرے بدلا ہوا تھا۔ انہوں نے زندگی کی کشاکش اور خارجی حالات کی کشمکش میں راست اور بھرپور حصہ نہ لیا ہو جس طرح نظریاتی طور پر ترقی پسند چاہتے تھے' حلقہ ارباب ذوق نے ادبی اقدار کو ملحوظ رکھا اور چاہا کہ ادب پہلے ادب ہو اور ادبی اقدار کا احترام کیا جائے۔ آیئے ہم ادب کے بارے میں حلقہ ہی کے ایک ترجمان کے خیالات سے واقفیت حاصل کریں۔

> ''ہمارے خیال میں ادب کی اولین خصوصیت یہی ہے کہ وہ اول اور آخر ادب ہو۔ ترقی پسندی اور رجعت پسندی بعد کی باتیں ہیں۔ جو چیز معیار پر پوری نہیں اترتی حلقہ کے نزدیک درخور اعتنا نہیں۔''
>
> (ادبی دنیا'' لاہور جولائی 1945 ص 44)

یہ اول وآخر والی بات حلقہ کے بعض ارکان میں انتہا پسندانہ حد تک ملتی ہے۔ ایسے افراد ادب کے ساتھ زندگی کو حشو وزاید میں شمار کرتے ہیں۔ اس انتہائی پسندی نے جو ایک طرح کی شدید داخلیت پسندی یا اس کا ردعمل تھی حلقہ کو روشن خیال لوگوں میں معروف ہونے نہیں دیا۔ یہ رجحان انفرادی طور پر حلقہ کے سرگرم رکن میراجی کے یہاں بہت زیادہ پایا جاتا ہے۔ ایک موقع پر انہوں نے لکھا ہے:

> ''اگر دو ایک لمحوں کے لیے فن برائے حیات کو تسلیم کر بھی لیا جائے تو ہم کہیں گے کہ فن برائے فن کے بغیر فن ہی نہیں ہو سکتا۔ پھر یہ برائے حیات کا دم چھلا کیسا۔ حقیقت میں تہذیب وتمدن نے جن حشو وزواید کو ہم پر طاری کر دیا ہے ان ہی میں سے برائے حیات کا تصور بھی ایک چیز ہے لیکن اسکا مطلب یہ نہیں کہ اس زمانے کے لوگوں کی باتیں زندگی کی ترجمان نہیں تھیں۔ یہ اور بات ہے کہ وہ لوگ حال کے بعض سیاسی نظریے اور سماجی واقتصادی نظام کے موجودہ رنگوں سے واقف نہ تھے۔'' (میراجی: ''دیباچہ'' 1941ء کی بہترین نظمیں۔ مرتبہ: حلقہ ارباب ذوق' لاہور۔ صفحہ 11)

بہر کیف بڑی حد تک یہ بات طے ہے کہ حلقہ ارباب ذوق کی ادبی اقدار کو معاشرہ کے سرد وگرم سے اس نوع کا تعلق نہیں تھا جو ادب برائے زندگی کے کٹر حامیوں کا تصور ہے۔ ویسے ن۔م۔ راشد نے جن کا حلقہ سے خاص تعلق خاطر تھا حلقہ کے رویہ کو نہایت معتدل اور متوازن انداز میں یوں بیان کیا ہے۔ انہوں نے لکھا ہے:

> ''جدید شاعری کی جس تحریک سے میں وابستہ ہوں اس کے دو بنیادی مقاصد تھے۔ فارم کی جگڑ بندیوں سے اردو شاعری کو آزاد کرانا اور دوسرے

معاصر زندگی کی حقیقتوں سے قریب لانا۔'' اس سے حلقہ اربابِ ذوق کے نصب العین کا اظہار ہوتا ہے کہ اس نے شعر و ادب اور معاصر زندگی کے رشتہ کو کس حد تک سمجھا اور اس پر زور دیا ہے اسی کے ساتھ یہ بھی حقیقت ہے کہ حلقہ اربابِ ذوق نے فنکار کے انفرادی احساس پر زور دیا جس کی وجہ سے خارجیت اور بیرون کی داخلیت داخل اور درون کو اہمیت دی گئی۔ انھوں نے شعور کو نظر انداز کیا ہو لیکن تحت الشعور اور لاشعور کی باتیں ان کے یہاں زیادہ پائی جاتی ہیں اور ترقی پسند شاعروں کے مقابلے میں حلقہ کے شاعروں کے یہاں احساس ذات شدید ہے۔ حلقہ کے شاعروں کے کلام کا مطالعہ کیجیے تو معلوم ہوگا کہ فرد اور معاشرہ کی کشمکش میں حلقہ اربابِ ذوق نے معاشرہ کے مقابلہ میں فرد اور ذات کو اہمیت دی۔ تحلیل نفسی اور تحت الشعور اور لاشعور کے رجحانات نے ان فکاروں کو اپنے درون میں جھانکنے اور داخل کا مطالعہ کرنے کی ترغیب دی۔ انہوں نے اسی کے ساتھ اپنی ذاتی کیفیات اور وارداتِ قلبی کو ظاہر کرنے کے لیے اسلوب میں نئے نئے تجربے کیے اور اوزان و بحور میں تبدیلیاں لائیں۔ چونکہ وہ اپنے تجربات اور واردات اور کیفیات کو من و عن اور تجریدی پیرایہ میں بیان کرنا چاہتے تھے اس لیے ان کو روایت کا سہارا لیتے ہوئے بھی روایت سے بغاوت کرنی پڑی۔ انھوں نے مروجہ اصطلاحات، استعارات، تشبیہات اور اشارات وغیرہ کو یا تو قطعی طور پر رد کر دیا یا ان کو نئے مفاہیم سے آشنا کیا۔ یہ تبدیلیاں اردو شاعری میں نئی ہی نہیں حیرت انگیز بھی تھیں چنانچہ اسی کے ساتھ یہ نکتہ بھی ملحوظ رہے کہ حلقہ اربابِ ذوق نے افادیت اور مقصدیت سے اپنے رشتہ کو قطعی طور پر نہیں توڑا بات صرف اتنی ہے کہ انھوں نے ترقی پسندوں کی طرح موضوع کو مقصدیت کی زنجیر نہیں پہنائی۔ بلکہ عملی طور پر خود کو زندگی کے چند موضوعات تک محدود رکھا۔ میراجی نے ''1941ء کی بہترین نظمیں'' میں لکھا ہے کہ ''خیال یا موضوع کے اعتبار سے اس کی افادیت کو ملحوظ بھی رکھا گیا خواہ وہ افادیت انسانی زندگی کے کسی بھی پہلو یا شعبہ سے تعلق رکھتی ہو یعنی نظری ہو یا عملی۔'' اس صراحت کی روشنی میں یہ نہیں کہا جا سکتا کہ حلقہ اربابِ ذوق کے ارکان نے زندگی سے اپنا تعلق منقطع کر لیا۔ حلقہ اربابِ ذوق کے ارکان نے اپنی ذات اور نج کو اہمیت ضرور دی لیکن خارج اور سماج کو نظر انداز بھی نہیں کیا۔ انھوں نے باغیانہ روش اختیار کی لیکن روایت کے احترام اور سماجی رشتہ کی پاسداری سے بھی گریز نہیں کیا اور تو اور میراجی کے یہاں بھی ''ابوالہول'' جیسی منظومات ملتی ہیں جن میں سماجی ورثہ کی تکریم پائی جاتی ہے اور ان پر اظہار افتخار بھی.....

الطاف گوہر نے جن کا حلقۂ اربابِ ذوق میں خاصا عمل دخل رہا، حلقہ کی تشکیل کے چھ سال بعد حلقہ کے شعری طریقۂ کار کی صراحت کرتے ہوئے جن باتوں کی نشان دہی کی ہے ان میں سے چند درج کی جاتی ہیں کہ ان سے حلقہ کے موقف کا اظہار ہوگا۔

1. اچھی شاعری وہ ہے جو اپنے ماحول سے آشنا ہوتے ہوئے ہمہ گیر تاثیر کی حامل ہو۔
2. شاعری اگر شاعری نہیں تو پھر جدید ہو یا قدیم سوختنی ہے۔
3. ہمارا احتجاج جمود کے خلاف ہے، روایات کے خلاف نہیں۔
4. شاعر کا واحد مقصد اپنے شدید طور پر محسوس کیے ہوئے تجربات کا مکمل اظہار ہے۔

واضح ہے کہ حلقہ کے نزدیک ماحول سے آگہی، نفسِ شاعری، روایات کی پاسداری اور شدید احساسات کی اہمیت ہے میراجی نے بھی ''اس نظم میں'' کے دیباچہ میں ادب کو زندگی کا ترجمان قرار دیا ہے وہ اپنے زاویہ سے ادب کو پیش کرنا چاہتے تھے اور ترقی پسند ادبی رجحانات سے فکری اختلاف کے باوجود ادب میں عصری زندگی کی عکاسی کے قائل تھے البتہ وہ اس کے خواہاں ضرور تھے کہ عصری مسائل اس طرح نہ پیش کیے جائیں کہ ادب صحافت بن جائے۔ اسی طرح ان کے ملحوظ نظر یہ بات بھی تھی کہ ادب پہلے ادب ہو، فن پہلے فن ہو۔ شاعری میں شاعر کی ذاتی زندگی کے تجربات کی جھلک ہو۔ حلقہ نے تجربے پر زور دیا لیکن اس شرط کے ساتھ کہ تجربہ نیا اور منفرد ہو۔ اسی طرح حلقہ نے موضوع کے انتخاب اور شاعر کے اندازِ نظر کو بھی اہمیت دی اور اس امر کی وضاحت کر دی کہ موضوع اچھوتا ہونا چاہیے اور اگر موضوع اچھوتا نہ بھی ہو تو کم از کم نظریہ جدید ہونا چاہیے۔ گویا حلقہ اربابِ ذوق کے قلم کار یہ رجحان رکھتے تھے کہ جدت یا انفرادیت ہو تو کوئی فن پارہ قابل قبول ہو سکتا ہے۔ چونکہ ترقی پسندوں نے ایسی کسی جدت پر زور نہیں دیا اس لیے میراجی اس کمی کو ترقی پسند تحریک کا المیہ قرار دیتے ہیں۔ ان باتوں سے حلقہ اربابِ ذوق کے اس میلان پر روشنی پڑتی ہے کہ تجربہ اور انفرادیت فن کے لیے بنیادی چیزیں ہیں۔ وہ اس معروف خیال سے اتفاق نہیں کرتے کہ شاعری نقل کی نقل کا نام ہے بلکہ وہ شاعری کو تخلیق قرار دیتے ہیں اور پھر بات وہیں پر آ جاتی ہے کہ فن پارے میں احساس، جذبہ یا تجربہ ہو اور اس کے اظہار میں جدت تا کہ جو بات ہو شاعر اپنے انداز سے کہے۔ حلقہ نے صرف تجربہ، جدت اور انفرادیت ہی پر زور نہیں دیا بلکہ اظہار اور ہیئت اسلوب میں بھی ان چیزوں کو ضروری قرار دیا۔ اس طرح نئی ہیئت اور نئے اسالیب کی گنجائش خود بخود پیدا ہو جاتی ہے۔

ہر چند کہ نظم نگاری کا تصور پہلے بھی تھا اور ترقی پسندوں نے بھی اس طرف توجہ دی تھی لیکن حلقہ والوں نے نظم کو ''عضویاتی وحدت'' کی شکل دیتے ہوئے اس کو غزل سے آزاد رکھنے کی کوشش کی اور اس کو ایک جمالیاتی تجربے کی حیثیت بھی دیدی۔ جہاں تک نظم کی ہیئت کا تعلق ہے اس بحث سے قطع نظر کہ آزاد نظم کو وسیلہ اظہار بنایا اور اس میں ایسے کئی تجربے کیے جس کی آزاد نظم متحمل ہو سکی تھی چنانچہ قافیہ در قافیہ اور اندرونی قافیوں کا استعمال بھی عام ہوا' طویل اور مختصر مصرعوں کی طرف بھی توجہ دی گئی' جملوں' سطروں اور اصوات کی تکرار ہوئی۔ نیز موضوعات کے تعلق سے بھی حلقۂ ارباب ذوق کا رجحان الگ رہا۔ ترقی پسندوں کی طرف سے حلقہ کے شاعروں پر جنس پرستی کا الزام عائد کیا گیا اور یہ بھی کہ وہ سماجی موضوعات کو رد کرتے ہیں لیکن ایسا نہیں کیونکہ میراجی 'مختار صدیقی' قیوم نظر' ضیا جالندھری اور خاص طور پر راشد کے ہاں سماجی اور سیاسی حالات کو نہایت اہتمام کے ساتھ موضوع بنایا گیا اور اس حد تک کہ سیاسی اور سماجی موضوعات سے بے توجہی کا الزام یکسر رد ہو جاتا ہے۔ اس سے انکار نہیں کہ حلقہ ارباب ذوق کے شاعروں کے یہاں انفعالی کیفیات ملتی ہیں۔ ہیئت' موضوعات اور اظہار و اسالیب کے ضمن میں انھوں نے بعض منفی صورتوں سے کام لیا لیکن انتہا پسند ترقی پسندوں نے جیسا کہ حلقہ کے شاعروں کو بدنام کرنے کی سعی کی یہ کوئی مستحسن اقدام نہیں تھا۔ اردو شاعری کو نئے افق سے روشناس کرانے' نئی جہات سے آشنا کرانے' نئی راہوں پر گامزن کرنے اور نئی بلندیوں کی سمت رواں کرنے میں حلقۂ ارباب ذوق کا رویہ بھی ممتاز' نمایاں اور اہم ہے۔ اردو شعر و ادب میں اور کئی تحریکات' نظریات اور میلانات کی طرح حلقہ ارباب ذوق کی اہمیت بھی لائق ذکر ہے۔ ہماری ادبی تاریخ میں حلقہ کے نام اور کام کو فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ یہی نہیں بعد ازاں بیسویں صدی کے ساتویں دہے میں جدیدیت وغیرہ کے جو رجحانات منظر عام پر آئے ان کی ساخت و پرداخت میں بھی حلقہ ارباب ذوق کے رجحانات اور شعری سرمایہ کا گراں قدر حصہ ہے۔

اپنی معلومات کی جانچ:

1. ترقی پسند تحریک کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کیجیے۔
2. ترقی پسند تحریک اور حلقہ ارباب ذوق کے مابین فرق تحریر کیجیے۔
3. حلقہ ارباب ذوق کے ہم رجحانات تحریر کیجیے۔

28.4 خلاصہ

اس اکائی میں ہم نے آپ کو حلقۂ ارباب ذوق کے بارے میں بتایا۔ حلقۂ ارباب ذوق کے قیام کے پس منظر اور قیام کے بارے میں آپ نے واقفیت حاصل کی۔ حلقہ ارباب ذوق کا قیام 29 اپریل 1939ء کو لاہور میں عمل میں آیا بعد ازاں دھیرے دھیرے دہلی میں بھی اس کی ایک شاخ قائم ہوئی اور شمالی ہند کے کئی علاقوں میں اس کو وسعت حاصل ہوئی۔ حلقے نے صرف ادبی اجتماعات ہی منعقد نہیں کیے بلکہ عملی طور پر شعر و ادب کے فروغ کے لیے بھی کام کیا۔ آپ کے علم میں بات بھی آئی کہ حلقہ نے کس طرح اپنے اجلاسوں کا انعقاد کیا اور پھر کس طرح اختلافات کے باعث حلقہ زوال کی سمت رواں ہوا۔ ایک کی بجائے تین حلقے منظر عام پر آئے۔ اور اب بھی برائے نام حلقہ ارباب ذوق کا وجود ہے۔ ہم نے حلقہ کے ادبی رجحانات کا بھی تفصیلی جائزہ لیا اور بتایا کہ حلقہ کے فن کاروں کے نزدیک اچھا ادب وہ ہے جو اپنے ماحول کا عکاس و ترجمان بھی ہو اور جس میں روایات کی پاس داری بھی موجود ہو۔ ادبی تخلیقات میں شدید احساسات اور انفرادی یا ذاتی تجربات کو غیر معمولی اہمیت حاصل ہوگی لیکن اس احتیاط کے ساتھ کہ فن بہر حال فن رہے صحافت نہ بن جائے۔

حلقہ نے ہیئت اور داخلیت پر زیادہ زور دیا لیکن سیاسی اور سماجی حالات سے بھی حلقہ کے شاعر بیگانہ نہیں رہے انھوں نے سیاسی' تہذیبی اور سماجی موضوعات پر اظہار خیال کیا اور اپنے زاویے کو کام میں لے آئے۔ آپ نے یہ بھی اندازہ لگایا کہ حلقہ ارباب ذوق کی مجموعی طور پر ہماری ادبی تاریخ میں بڑی اہمیت ہے۔ آپ نے اپنی معلومات کی جانچ بھی کی۔ آخر میں امتحانی سوالات بھی دیے گئے ہیں اور فرہنگ کے تحت مشکل الفاظ کے معنی بھی ہیں۔ سفارش کردہ کتابوں کی فہرست بھی دی جا رہی ہے کہ آپ اس موضوع پر اپنے مطالعہ کو اور آگے بڑھائیں۔

28.5 نمونہ امتحانی سوالات

ذیل کے سوالوں کے جواب تیس تیس سطروں میں دیجیے۔

1. حلقۂ اربابِ ذوق کی سرگرمیوں کا تفصیلی جائزہ لیجیے۔
2. حلقۂ اربابِ ذوق کے رجحانات پر سیر حاصل مضمون لکھیے۔

ذیل کے سوالوں کے جواب پندرہ پندرہ سطروں میں دیجیے۔

1. حلقۂ اربابِ ذوق کے قیام کا پس منظر بیان کیجیے۔
2. ترقی پسند تحریک کن معنوں میں حلقۂ اربابِ ذوق کی ضد تھی؟ لکھیے۔

28.6 فرہنگ

الفاظ	=	معنی	الفاظ	=	معنی	الفاظ	=	معنی
خلجان	=	اندیشہ، خلش	آویزش	=	لڑائی، فساد	فاشزم	=	جمہوریت دشمن نظریہ
بصیرت	=	دانائی، دل کی بینائی	ادراک	=	عقل، فہم	ناگزیر	=	ضروری، لازم
مسدود	=	ختم، بند کیا گیا	مصارف	=	اخراجات	غیر آئینی	=	بنیادی قوانین کے خلاف
ضم	=	ملانا، شامل کرنا	خمیر	=	فطرت، مزاج	مسخر	=	تسخیر کیا گیا، فتح کیا گیا
انحطاط	=	زوال، کمی گھٹاؤ	مجہولیت	=	سستی، نکماپن	درخور اعتنا	=	توجہ کے قابل
حشو و زواید	=	زاید، بے ہودہ کلام	تجریدی	=	مشکل، پیچیدہ	پاسداری	=	مروت، لحاظ، حمایت
المیہ	=	دردناک واقعہ	انفعالی	=	شرمندہ کرنے والی			

28.7 سفارش کردہ کتابیں

1. یونس جاوید — حلقہ اربابِ ذوق
2. سردار جعفری — ترقی پسند ادب

اکائی 29 : جدیدیت اور اردو شاعری

ساخت

29.1 تمہید

29.2 جدیدیت کی فکری اور فلسفیانہ بنیادیں

29.3 جدت پسند یا فیشن پسند شاعری

29.4 جدیدیت پسند غزلیں

29.5 جدیدیت پسند نظمیں

29.6 خلاصہ

29.7 نمونہ امتحانی سوالات

29.8 فرہنگ

29.9 سفارش کردہ کتابیں

29.1 تمہید

بیسویں صدی کی ابتدا ہی سے ترقی یافتہ ملکوں کا سیاسی، سماجی اور اقتصادی منظر نامہ بڑی تیزی سے بدلنے لگا۔ سائنس اور ٹیکنالوجی کی ترقی، نئے انکشافات اور ایجادات کا سبب بنی۔ تحقیق و تدقیق سے نہ صرف کئی مخفی حقیقتوں کی بازیافت ہوئی بلکہ مستقبل کے خواب کا ایک لامتناہی سلسلہ ترتیب پایا۔ یہ ضرور ہے کہ اس طرح انسانی فلاح و بہبود کے نئے امکانات پیدا ہوئے مگر ساتھ ہی ساتھ انسانیت کو ضرر بھی پہنچا۔ سیاسی اور اقتصادی برتری کے ساتھ ساتھ مذہبی اور نسلی تفوق کی جدوجہد ایک خطرناک دہانے پر پہنچ گئی۔ سیاسی انقلابوں، صنعتی ارتقا اور جنگی معرکوں سے کئی ملکوں میں اتھل پتھل ہوئی۔ چھٹی دہائی آتے آتے امریکہ اور روس کی سرد جنگ اور روس اور چین کے آپسی اختلافات سے الجھاؤ اور بحران شدت اختیار کر گیا۔ عالمی اصول اور ضابطے نئے سرے سے رقم ہونے لگے۔ سماجی اور تہذیبی قدریں بھی بکھراؤ کا شکار ہوئیں اور ان کا گہرا اثر فکر و فلسفہ اور شعر و ادب پر ہوا۔ عدم تحفظ، تذبذب، خوف، گمنامی، تنہائی، اجنبیت، بے چہرگی، بے رشتگی، لافردیت، لایعنیت، فراریت، انکاریت، وہم اور تشکیک وغیرہ ایسے احساسات تھے جو اس عہد کے دانشوروں اور قلمکاروں کو بے چین کیے ہوئے تھے اور وہ یوروپی مفکروں اور فلسفیوں کے تصورات و نظریات کی چھاؤں میں پناہ لینے پر مجبور ہونے لگے۔ برصغیر میں آزادی کے بعد ہونے والے ہولناک فرقہ ورانہ فسادات سے سماج پرستی، اجتماعیت اور مذہبی اشتراک کے کھوکھلے نعروں کی اصلیت ظاہر ہوگئی۔ 1962ء میں رہا سہا بھرم ہندوستان پر چینی حملے سے کھل گیا۔ اشتراکی سیاست کے ساتھ ساتھ ترقی پسند ادبی تحریک بھی تعطل اور انتشار میں مبتلا ہوگئی۔ سرمایہ دارانہ نظام، سماجی نابرابری اور غریبوں اور محنت کشوں کے استحصال کے خلاف آواز اٹھانے والے قلمکار مایوس ہوتے گئے نیز حلقۂ ارباب ذوق، سے منسلک قلمکار زیادہ توانائی اور آزادی کے ساتھ اپنے جذبات و احساسات کی ترجمانی کرنے لگے۔ انہیں یوروپی تصورات اور نظریات سے سہارا ملنے لگا جس سے عصری قلمکاروں نے یہ مطمح نظر بنایا کہ فرد سماج کا محض ایک پرزہ نہیں ہے۔ وہ اپنی ایک حقیقت، اہمیت اور وجود رکھتا ہے۔ اسی وجود سے سماج میں رنگینی اور گہما گہمی ہے۔ ترقی پسندی میں سماج کے ذریعے فرد کی پہچان بنتی تھی۔ جب کہ اس نئے خیال سے معاملہ الٹ گیا۔ فرد کے توسط سے سماج ہی نہیں پوری کائنات کی شناخت ہونے لگی۔ طبیعاتی اور مابعد الطبیعیاتی، مادی اور روحانی منطقوں کی بازدید بھی ہوئی۔ اس نئی حقیقت یا رجحان کو جدیدیت کا نام دیا جاتا ہے۔

29.2 جدیدیت کی فکری اور فلسفیانہ بنیادیں

ہر ادبی تحریک کسی مرکزی نظریے یا مقصد سے وابستہ ہوا کرتی ہے مگر جدیدیت کوئی تحریک نہیں ہے۔ یہ ایک رجحان یا رویہ ہے اور کسی ایک نظریے تک محدود نہیں ہے بلکہ یوروپی مفکروں اور فلسفیوں کے مختلف النوع تصورات اور نظریوں پر مبنی ہے۔ اسپنسر، بارتھ، اسٹاک مان، ارنسٹ ماخ، برٹرینڈ رسل، ہیوم، فرائڈ، اڈلر، ینگ، کروچے، کرکے گارو ڈ اور سارتر وغیرہ نے اپنے خیال اور نظریے سے علمی اور ادبی دنیا میں تہلکہ مچا دیا تھا۔ ایسے نظریوں میں معرفت پسندی (Theosophism) انفرادیت پسندی (Individualism) ماورائے حقیقت پسندی (Surrealism) ماورائیت (Transcendentalism) انکاریت (Nihilism) پیکریت (Imagism) تاثریت (Impressionism) عملیت (Pragmatism) نراجیت (Anomat) لایعنیت (Absurdism) شعور کی رو (Stream of Consciousness) تحت الشعور (Sub consciousness) لاشعور (Collective Unconsciousness) وجودیت (Existentialism) وغیرہ خاصے مقبول ہوئے۔ ان سب کا تعلق انسان کے باطن سے تھا اور ان کے اثرات بڑے دوررس تھے۔ یہی سبب ہے کہ صنعتی، اقتصادی، سیاسی، سماجی اور تہذیبی انقلابات سے دوچار ہونے والا انسان اندر سے اور مضطرب ہوا۔ وہ ایک قسم کی ذہنی، محسوساتی اور نفسیاتی کشمکش اور پیچیدگی میں مبتلا ہو کر اپنے آپ میں گم ہوتا گیا اور اس داخلی شکست و ریخت سے جو نئی حسیت پیدا ہوئی، جدیدیت پسند ادب میں اس کی کلیدی حیثیت ہے۔

اپنی معلومات کی جانچ

1. جدیدیت تحریک ہے یا ادبی رجحان؟
2. دو ایسے مفکروں کے نام بتایئے جن سے جدیدیت متاثر ہوئی۔
3. ایسے دو نظریوں کے نام لکھیے جو جدیدیت کے محرک ہیں۔
4. جدیدیت میں داخلیت حاوی ہے یا خارجیت؟
5. جدیدیت کیا ہے؟

29.3 جدت پسندی یا فیشن پرست شاعری

جدیدیت کے زیر اثر اردو شاعری کے موضوع، اسلوب اور ہیئت تینوں سطحوں پر واضح تبدیلیاں آئیں۔ ترقی پسندوں نے نظم پر زیادہ توجہ دی تھی مگر جدیدیت پسند شاعروں نے نظم اور غزل دونوں صنفوں میں اپنے فکر و خیال کی ترجمانی بھی کی اور نئے تجربے بھی کیے۔ ہیئت میں نیا پن لانے کے لیے آزاد نظم، نثری نظم، آزاد غزل اور نثری غزل کے امکانات پر غور کیا گیا ہے۔ آزاد نظم پہلے سے رائج تھی اسے مزید تقویت ملی مگر دوسرے ہیتی تجربے کامیاب نہ ہو سکے۔ کچھ عرصہ بعد نثری نظم جڑ پکڑنے لگی۔ آزاد اور نثری غزل کا تجربہ برائے تجربہ ہی رہا۔ جدت پسندی یا فیشن پرستی کی یہ لہر نئی ہیئتوں تک محدود نہ رہی بلکہ روایتی صنف غزل کی اسلوبیاتی سطح پر بھی ابھر کر سامنے آئی۔ جدیدیت کی شروعات کے دوران بعض شاعروں نے غزل کے بنے بنائے مزاج اور لفظیاتی نظام پر کاری ضرب لگائی نیز ایک بالکل نیا اور انوکھا علامتی اور استعاراتی پیرایہ اختیار کیا جس میں خاصا تنوع بھی تھا اور ابہام بھی۔ غزل نہ اس کی خوگر تھی نہ متحمل۔ مثال کے طور پر یہ اشعار دیکھے جا سکتے ہیں

سورج کو چونچ میں لئے مرغا کھڑا رہا
کھڑکی کے پردے کھینچ دیے رات ہوگئی

(ندا فاضلی)

بھاگی چلی آرہی ہے دیکھو تو
بستی ہے شکار ' شام چیتا ہے (شمس الرحمٰن فاروقی)

مرجھا کے کالی جھیل میں گرتے ہوئے بھی دیکھ
سورج ہوں میرا رنگ مگر دن ڈھلے بھی دیکھ
(شکیب جلالی)

گلدان میں گلاب کی کلیاں مہک اٹھیں
کرسی نے اس کو دیکھ کے آغوش وا کیے (محمد علوی)

اس قسم کے شعروں کی مختلف انداز سے تعبیر وتشریح کی گئی۔ پھر بھی 'سورج کی چونچ میں مرغا' شام کا چیتا ہونا' 'سورج کا کالی جھیل میں گرنا' اور 'کرسی کا آغوش وا کرنا' کسی بھی طرح غزلیہ اسلوب اور لہجے سے لگا نہیں کھاتے ہیں۔ اس لیے ان نمونوں یا اس طرح کے دوسرے نمونوں کو محض ایک جدت پسند بیانیہ کہا جائے گا۔ صنف نظم میں بھی اس کی پیروی کی گئی۔ شہریار کی یہ نثری نظم اس کی ایک مثال ہے

لیکن تم یہ نہیں جانتے تھے کہ
تلوار کی چمک خون سے قائم رہتی ہے
اور خون بھی دشمن ' دوست کا نہیں
لیکن تم اپنے دشمن سے ناواقف تھے
اس لیے تمہاری تلوار زنگ آلود ہے !

(مجموعہ۔ ''ساتواں در'')

ہر چند یہ نظمیہ اسلوب مذکورہ غزلیہ اسلوب سے مختلف ہے اور اس میں لفظوں کی انوکھی ترتیب نہیں ہے اور نہ گمبھیر علامت یا استعارہ ہے مگر یہ اکہرا اسلوب نہ احساس کی جلوہ نمائی کرتا ہے نہ ہی شعریت بداماں ہے۔ اسی بنا پر اسے بھی جدت پسندی یا روایت شکنی کا نمونہ قرار دیا جائے گا۔ ایسی مثالیں ابتدائی دور میں ملتی ہیں۔ جدیدیت کے استحکام کے بعد انہیں ناپسند کیا جانے لگا اور آہستہ آہستہ ان کا خاتمہ ہو گیا۔

اپنی معلومات کی جانچ:

1. کسی ایک جدت پسند غزل گو کا نام بتائیے۔
2. جدت پسندی یا فیشن پرستی کس دور میں ابھری؟
3. جدت پسندی کی اہم خصوصیت کیا ہے؟
4. جدت پسندی کا مظاہرہ کن شعری ہیئتوں میں کیا گیا؟
5. جدت پسندی کا خاص تعلق موضوع سے تھا یا اسلوب سے۔
6. جدت پسندی کا آئینہ دار ایک شعر لکھیے۔

29.4 جدیدیت پسند غزلیں

جدیدیت پسند شاعروں نے اردو غزل میں موضوع اور اسلوب کی سطح پر بڑی خوشگوار اور دلکش تبدیلیاں کیں۔ حالانکہ غزل کے کلاسیکی مزاج میں

تبدیلی لانے کی کوشش 1857ء کے بعد خاص طور پر حالؔی کے ذریعے ہو چکی تھی اور فکر و خیال کو ایک نیا موڑ دے کر آسان لفظوں میں ڈھالا گیا تھا جس سے غزل میں قدرے اکہرا پن آ گیا تھا پھر بھی اسے اجتہادی اقدام ماننا ہوگا۔ جدیدیت پسند شاعروں کی اہم دین یہ ہے کہ انہوں نے فرد کے حوالے سے کائنات کی بے شمار صداقتیں اپنی شعری کائنات میں سمیٹ لیں نیز ان کی پیش کش میں یہ اہتمام کیا کہ موسیٰ و طور، مریم و عیسیٰ یوسف و زلیخا، شیریں و فرہاد، قفس و آشیاں، کعبہ و کلیسا، صیاد و گلچیں، ساغر و مینا، ساقی و میخانہ اور واعظ و محتسب جیسی کثرت سے استعمال ہونے والی کلاسیکی تلمیحوں، اشاروں اور استعاروں سے شعوری طور پر گریز کیا۔ شاعری کا رشتہ اپنی دھرتی سے استوار کرتے ہوئے تخلیقی سطح پر ایسی علامتیں اور تلازمے وضع کیے جن میں صداقتوں کے نئے گوشے بھی ضم ہو جائیں اور بیان کی تہہ داری اور پہلو داری بھی موجود رہے۔ سورج، چاند، رات، اندھیرا، اجالا، دھوپ، پرچھائیں، دھند، حصار، سمندر، جھیل، دریا، کشتی، بادبان، جزیرہ، شہر، بستی، گھر، مکان، پتھر، ریت، راکھ، درخت، پتا، پھول، تتلی، مچھلی وغیرہ ایسے الفاظ ہیں جنہیں مختلف معنی میں بالتکرار استعمال کیا گیا۔ نئی شعری روایت میں ان کی حیثیت کہیں اشارے کی ہے، کہیں علامت کی اور کہیں استعارے کی۔ اصل خصوصیت یہ ہے کہ یہ بالکل سامنے کے ہیں، ان کی توجیہہ کے لیے ایک قاری کو ماضی کی ورق گردانی نہیں کرنا پڑتی ہے اور مفہوم اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ اس خوبصورت غزلیہ آہنگ سے ابھرتا ہے۔ ذیل کے شعروں سے یہ بات زیادہ واضح ہو جائے گی۔

زمیں پہ چاند اُترتا دکھائی دیتا ہے
ترا خیال بھی تجھ سا دکھائی دیتا ہے

(خورشید احمد جامؔی)

اپنی ہی یادوں کی بوسیدہ ردا لے جائے گا
میرے گھر تک بھی وہ گر آیا تو کیا لے جائے گا

(مظہؔر امام)

شہر تمنا کے باشندے آ پھنسے کس بستی میں
نیچے کانٹے، آگے پیچھے، دائیں بائیں سر پر دھوپ

(مظفؔر حنفی)

دھیان کی سیڑھیوں پہ پچھلے پہر
کوئی چپکے سے پاؤں دھرتا ہے

(ناصؔر کاظمی)

اجڑ چکی ہے یہ بستی مگر وہ شخص ابھی
بڑے خلوص سے دل کے کھنڈر میں رہتا ہے

(محمد علی اثؔر)

ابھی میں اپنے گھر میں سو رہا تھا
ابھی گھر سے میں بے گھر ہو گیا ہوں

(محمؔد علوی)

نہ جس کا نام ہے کوئی، نہ جس کی شکل ہے کوئی
اک ایسی شے کا کیوں ہمیں ازل سے انتظار ہے

(شہریاؔر)

آگے آگے کوئی مشعل سی لیے چلتا تھا
ہائے کیا نام تھا' اس شخص کا پوچھا بھی نہیں

(شاذ تمکنت)

اب ملے ہم تو کئی لوگ بچھڑ جائیں گے
انتظار اور کرو اگلے جنم تک میرا

(بشیر بدر)

یہ چاہا تھا کہ پتھر بن کے جی لوں
سو اندر سے پگھلتا جارہا ہوں

(سلیم احمد)

دلوں کی اُور دھواں سا دکھائی دیتا ہے
یہ شہر تو مجھے جلتا دکھائی دیتا ہے

(احمد مشتاق)

ان شعروں کے موضوعات نئے نہیں ہیں۔ان میں عشق کی آنچ ہے' کسک ہے۔محرومی کا احساس ہے۔محزونی کا ذائقہ ہے۔عشق ومحبت کی ناکامی' یادوں کی ایک چلمن چھوڑ جاتی ہے جس سے حزن آمیز کرنیں بکھرتی رہتی ہیں۔اس طرح کے احساسات اور اس نوع کی داخلیت کی ملفوظی مصوری کلاسیکی شاعروں نے بھی کی ہے اور بعد کے شاعروں نے بھی۔پھر سوال یہ اٹھتا ہے کہ آخر مرقومہ بالا شعروں کی ندرت کیا ہے؟ جدیدیت پسند شاعروں نے اپنی تخلیقی نادرہ کاری کا جوہر کہاں دکھایا ہے؟ ایک باشعور قاری کے لیے یہ سوال مشکل نہیں۔اظہار وبیان کی لفظیات عہد کی جدید حسیت اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے اور داخلیت کی ملفوظی مصوری کی ایک نئی صورت اور نئی جہت عکس پذیر ہوئی ہے۔ساتھ ہی ساتھ معنیاتی افق میں کشادگی آئی ہے۔اس عمل میں کہیں بھی تکدر یا ناگواری پیدا نہیں ہوئی بلکہ غزلیہ اسلوب میں معیاری اور باوقار اضافہ ہوتا ہے۔

جدیدیت پسند شاعری میں احساس تنہائی اپنے مضمرات کے ساتھ ایک اہم اور کلیدی وصف بن گیا ہے۔اس سے کئی مثبت اور منفی احساسات پے در پے جنم لیتے ہیں اور اصلاً یہ سب نظریۂ وجودیت کی کہکشاں ہیں۔وجود کی سطح پر فرد کے ذہن میں تنہائی کی کئی صورتیں نظر آتی ہیں مثلاً

1. بیگانگی (Alienation)　　2. علاحدگی (Isolation)
3. گوشہ نشینی (Solitude)　　4. اکیلاپن (Aloneness)　　5. تنہائی (Loneliness)

یہ ساری صورتیں ایک دوسرے سے منسلک ہیں لیکن ان کے مدارج الگ الگ ہیں:

شہر وفا میں دھوپ کا ساتھی کوئی نہیں
سورج سروں پہ آیا تو سائے بھی گھٹ گئے

(بیگانگی۔پروین شاکر)

اب میں اک موج شب تار ہوں ساحل ساحل
راہ میں چھوڑ گیا ہے مرا مہتاب مجھے

(بیگانگی۔شہاب جعفری)

دم بخود تھے لوگ اپنے آپ سے سہمے ہوئے
گھر کے اندر عافیت کا ایک بھی گوشہ نہ تھا

(علاحدگی۔نشتر خانقاہی)

آج محصور ہیں دیمک زدہ دیواروں میں
ہم جو شامل تھے کبھی شہر کے معماروں میں

(علاحدگی۔پرت پال سنگھ بیتاب)

اتنا مانوس ہوں سناٹے سے
کوئی بولے تو برا لگتا ہے

(گوشہ نشینی۔احمد ندیم قاسمی)

رہتے ہیں اہل شہر کے سایے سے دور دور
ہم آہوانِ دشت کی صورت ڈرے ڈرے

(گوشہ نشینی۔احمد فراز)

اس اکیلے پن کے ہاتھوں ہم تو فکری مر گئے
وہ صدا جو ڈھونڈلی تھی جنگلوں میں کھوگئی

(اکیلا پن۔پرکاش فکری)

اکیلا چاند آئینے کو ترسے
بھرے تالاب میں کائی پڑی ہے

(اکیلا پن۔شاہین غازی پوری)

ایک مدت سے چراغوں کی طرح جلتی ہیں
ان ترستی ہوئی آنکھوں کو بجھادو کوئی

(تنہائی۔ساقی فاروقی)

اپنی عظمت کی داستاں لے کر
گاؤں میں رہ گیا کھنڈر تنہا

(تنہائی۔ملک زادہ جاوید)

احساس تنہائی کی صورتوں کے علاوہ ایک صورت اجنبیت ہے۔اسے احساس تنہائی کی پہلی سیڑھی بھی کہا جاسکتا ہے۔جدیدیت پسند غزل میں اس کا بھی پُر اثر عکس ملتا ہے:

خوشیوں کی دھوپ، درد کے سائے کہاں گئے
وہ لوگ جو تھے اپنے پرائے کہاں گئے

(معنی تبسم)

اب تو اپنے آپ کو بھی اجنبی لگتا ہوں میں
کون مجھ سے چھین کر میری نشانی لے گیا

(سلطان اختر)

زندگی کی بے معنویت اور بے ہمتی، رشتوں کی بے رشتگی، چہروں کی بہ چہرگی، مایوسی، خوف، فنا پرستی، لایعنیت، بے وطنی، ہجرت، انفعالیت، احتجاج، تشدد، حسرت تعمیر، اثبات ذات وغیرہ ایسے بے شمار موضوعات ہیں، جنہیں جدیدیت پسند غزل گوؤں نے بڑے سلیقے سے برتا ہے۔ مثلاً چند شعر دیکھیے

خنجر بکف تھے لوگ کھڑے اس کے اردگرد
نکلا نہ ایک شخص بھی جلتے مکان سے

(پرکاش فکری)

بارش کی بوند بوند سے ڈرتا تھا میرا دل
اک ریت کے مکان کا معمار میں بھی تھا

(مخمور سعیدی)

عجیب خواب تھا تعبیر کیا ہوئی اس کی
کہ ایک دریا ہواؤں کے رخ پہ بہتا تھا

(آشفتہ چنگیزی)

یہ اک ابر کا ٹکڑا کہاں کہاں برسے
تمام دشت ہی پیاسا دکھائی دیتا ہے
نہ اتنی تیز چلے سرپھری ہوا سے کہو
شجر پہ ایک ہی پتا دکھائی دیتا ہے

(شکیب جلالی)

مرے خدا مجھے تو اتنا معتبر کردے
میں جس مکان میں رہتا ہوں اس کو گھر کردے

(افتخار عارف)

ہر نئی نسل کو ایک تازہ مدینے کی تلاش
صاحبو! اب کوئی ہجرت نہیں ہوگی ہم سے

(افتخار عارف)

اب کے ہم بچھڑیں تو شاید کبھی خوابوں میں ملیں
جس طرح سوکھے ہوئے پھول کتابوں میں ملیں

(احمد فراز)

دن کی دیکھی ہوئی ہر شکل بدل جائے گی
رات کے ساتھ ذرا گھر سے نکل کر دیکھو

(مخمور سعیدی)

جسم اپنا ہے کوئی اور نہ سایہ اپنا
جانے اس زیست سے ہے کون سا رشتا اپنا

(مصورؔ سبزواری)

منیرؔ اس ملک پر آسیب کا سایہ ہے یا کیا ہے
کہ حرکت تیز تر ہے اور سفر آہستہ آہستہ

(منیرؔ نیازی)

دھوپ نکلی دن سہانے ہوگئے
چاند کے سب رنگ پھیکے ہوگئے

(ناصرؔ کاظمی)

یہ اشعار اپنے خالق کے زمینی رشتے کے ترجمان ہیں۔ ان کی بنت میں عصری آگہی ہے جو ان گنت مسائل اور داخلی کیفیتوں کے خمیر سے ابھری ہے۔ انسان جب خارجی دنیا میں اپنی نامرادیوں' ناکامیوں اور ناآسودگیوں سے تنگ آ کر ایک نوع کی بے نیازی اور لاپرواہی میں گرفتار ہونے لگتا ہے۔ لاچاری اور فطری مایوسی' ذاتی اور داخلی کرب کی شکل اختیار کرنے لگتی ہے تو اس کی آنکھیں اندر کی طرف کھلنے لگتی ہیں۔ وہ اپنے آس پاس کی دنیا سے ناامید ہوجاتا ہے اور خود اپنا چارہ گر بن جاتا ہے۔ اسے نہ کسی نشان راہ کی تلاش ہوتی ہے نہ خواب ناک دنیا کی۔ وہ اپنے آپ میں مگن رہتا ہے۔ اکتاہٹ' اضطراب' بے سمتی' بے معنویت' استعجاب اور خالی پن کے احساسات اسے ایک مسلسل اذیت میں مبتلا رکھتے ہیں اور وہ اندر ہی اندر گھلتا رہتا ہے مگر اس اذیت میں ایسی لذت ملتی ہے کہ اس کے لیے اپنے خول سے نکلنا کٹھن ہوجاتا ہے۔ جدیدیت پسند غزلوں میں عہد کی یہ کھری سچائیاں بڑی کربناکی کے ساتھ منکشف ہوئی ہیں:

رہ گذر سونی' سیہ' اندھی مسافت ہے بہت
یہ کہ ہے دشت انا' اس میں اذیت ہے بہت

(لطفؔ الرحمٰن)

آئینہ توڑ کے چہرا دیکھوں
عکس کمرے میں تڑپتا دیکھوں

(باقر مہدیؔ)

دشائیں چھورہی ہیں آج مجھ کو
نکل کر خود سے باہر آگیا ہوں

(کمار پاشیؔ)

تری صدا کا ہے صدیوں سے انتظار مجھے
مرے لہو کے سمندر ذرا پکار مجھے

(خلیل الرحمٰنؔ اعظمی)

مجز ہجوم بے کراں کچھ بھی نہ تھا
منظروں کے درمیاں کچھ بھی نہ تھا

(علیم اللہ حالیؔ)

یوں تو ان موضوعات میں گونا گونی اور تنوع ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے ایک ہی عہد میں فکر و احساس کی ایک یلغار ہو گئی ہو' ایک طوفان آ گیا ہو مگر اس کثرت میں وحدت کی تلاش کی جائے تو انسان کی باطنی تاریخ کا ایک نگار خانہ ترتیب پا جائے گا جس میں زندگی کی تہہ داری' گہرائی' پھیلاؤ' تسلسل' ردو قبول اور عمل اور ردعمل سب کچھ نظر آئے گا اور یہ سب کچھ وجود کے معنی خیز داخلی سفر سے عبارت ہے۔ جس کے لمحے لمحے کی جمالیاتی اور ملفوظی تصویریں اور حسّی پیکر جدیدیت پسند غزلوں میں ملتے ہیں۔ ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ نازک حسّی تجربوں اور پر پیچ داخلی سفر کی جستہ جستہ روداد پیش کرنے کے لیے شیریں' سلیس اور رواں الفاظ استعمال کیے گئے ہیں۔ ان کی نشست و برخاست' ترتیب اور تنظیم سے ایک نغمہ بار اکائی بنتی ہے۔ جس میں آسان ڈکشن' شگفتہ علامتیں' موثر استعارے اور سجیلے رمز و اشارے سمائے ہوئے ہیں۔ ان ہی خصوصیتوں کی بنا پر جدیدیت کے زیر اثر اردو غزل موضوع و اسلوب اور لب و لہجے کے اعتبار سے نئی سمت سے بھی آشنا ہوتی ہے اور اپنی ایک شناخت بھی بناتی ہے۔

اپنی معلومات کی جانچ

1. جدیدیت کے زیر اثر غزل میں کس سطح پر تبدیلی آئی؟
2. ایسے پانچ الفاظ لکھیے جنہیں جدیدیت پسند غزل گوؤں نے بالتکرار برتا ہے۔
3. کسی بڑے جدیدیت پسند غزل گو کا نام لکھیے۔
4. جدیدیت پسند غزلوں کا محور کیا ہے؟
5. دو جدیدیت پسند شعر تحریر کیجیے۔
6. جدیدیت پسند غزل میں نئی حسّیت سے کیا مراد ہے؟

29.5 جدیدیت پسند نظمیں

نظم ایک بیانیہ صنف شاعری ہے۔ اس میں اشاروں' کنایوں اور علامتوں کا نظام تو ہوتا ہے یا ہو سکتا ہے مگر اس میں ہم آہنگی استحکام اور گٹھاؤ ویسا نہیں ہوتا ہے جیسا غزل میں ہوتا ہے کیوں کہ نظم میں ارتقا اور تسلسل کی گنجائش ہے۔ جدیدیت کے زیر اثر اس صنف میں بھی خوشگوار موڑ آیا ہے۔ نئی حسّیت علی الخصوص احساس تنہائی اپنے تمام مضمرات اور پیچیدگیوں کے ساتھ ابھر کر سامنے آئی ہے :

میں نے زہد و تقویٰ کا ملبوس اتار دیا ہے
اور پراگندہ مٹی میں دفن کہنہ سے صدہا صد سالوں پوشیدہ تن
کو میلا کر کے عریاں کر ڈالا ہے
لیکن اب تو شب کا نور نکھر آیا ہے
سورج جاگ پڑا ہے
سارے سائے خاک ہوئے ہیں
اور بدن آلائش سے آلودہ نہیں
دیواریں ہیں دیواریں جو تنہائی کا چہرہ ہیں (تنہائی کا چہرہ۔ افتخار جالب)

یہ علاحدگی اور گوشہ نشینی کا وہ شدید روپ ہے جو بدلے ہوئے سماج اور بدلی ہوئی تہذیب کے ردعمل میں سامنے آیا ہے' زہد و تقویٰ کا ملبوس' نمائشی اصول اور بندھن کی علامت ہے۔ اس کے ساتھ بلکہ متقابل' پراگندہ مٹی میں دفن کہنہ' نمائش اور کھوکھلے اصولوں سے چھٹکارے کا علامیہ ہے۔ ظاہر ہے چھٹکارا پانے کے بعد من کے اندر اترنے کا سلسلہ شروع ہوتا ہے جہاں روشنی ہے اور سکون ہے۔ دراصل تنہائی کا احساس محض جسمانی یا جذباتی سہارے کی عدم موجودگی سے پیدا ہوتا بلکہ ایک نوع کے تہذیبی اور نفسیاتی ردعمل کے طور پر بھی ابھرتا ہے اور یہ ردعمل زندگی کی ناہمواریوں یا نامساعد حالات میں ہوتا ہے :

عمر اک چیخ کی میعاد ہے
تم بھی چیخو
اتنی شدت سے کہ اک مدت تک
وقت کو یاد رہے
جنگلوں اور پہاڑوں میں یہ فریاد رہے (وقت۔قاضی سلیم)

کبھی کبھی ردعمل کا ایک اور رنگ ابھرتا ہے۔ناموافق ماحول سے مفاہمت نہ کرنے کی بنا پر فرد آس پاس کی ہر چیز سے لاتعلق ہو جاتا ہے۔اس کے لیے ہر دیکھی بھالی موجود چیز اجنبی ہو جاتی ہے یہاں تک کہ اس کا اپنا وجود بھی اسے اجنبی لگنے لگتا ہے

میں منظر ہوں تسلسل ہوں
مگر میں اجنبی کیوں ہوں
یہ فرش آب وگل میرے لیے اک سلسلہ کیوں ہے
پرندہ آسماں کی نیلگوں محراب کے اس پار جاتا ہے
پرندہ فاصلہ کیوں ہے
پرندہ ماورا کیوں ہے

(پرندہ۔بلراج کومل)

اجنبیت ہی کا ایک پہلو بیگانگی ہے۔اس کی منظوم شکل بھی دیکھی جا سکتی ہے:

سنسان ہیں مکان کہیں در کھلا نہیں
کمرے سجے ہوئے ہیں مگر راستہ نہیں
ویراں ہے پورا شہر کوئی دیکھتا نہیں
آواز دے رہا ہوں کوئی بولتا نہیں

(میں اور شہر۔منیر نیازی)

شارع عام پر حادثہ ہو گیا
آدمی کٹ گیا
اس کا سر پھٹ گیا
بھیڑ بہتی رہی
بات کرنے میں جو تھے مگن
بات کرتے رہے
قہقہے چیخ کے پر کرتے رہے
اور اکثر جو خاموش تھے
چپ گذرتے رہے
آدمی مر گیا! (سندباد۔عمیق حنفی)

صنعتی سماج کی تیز رفتار زندگی نے آدمی کو آدمی سے جدا کر دیا ہے۔ آدمی کے اندر کا انسان ہار چکا ہے۔ ماضی اور حال سے اس کا بڑا ڈھیلا ڈھالا ناتا رہ گیا ہے۔ بس ایک دوڑ ہے مستقبل کی طرف جس میں بیشتر لوگ شریک ہیں۔ کسی پل چین، سکون اور آسودگی نہیں ہے۔ ہر چیز سے بے نیاز ہو کر متحرک اور فعال رہنے کا نام زندگی ہے اور زندگی کا یہی روپ بیگانگی اور اکیلے پن کا احساس پیدا کر رہا ہے

ہم اجنبی تھے شہر میں، ہمارا کون تھا وہاں
قطار در قطار سامنے تھے ان گنت مکاں
مگر ہمارے سر پہ چیختا رہا تمام شب مہیب آسماں (سائے کے ناخن۔ بلراج کومل)

ان نظمیہ ٹکڑوں میں جدید دور کے فرد کے اندر سے ٹوٹنے کی چیخ ہے، ایک اندوہناک اور دردناک چیخ، جو قاری کا ذہن جھنجھوڑتی ہوئی رگ و پے میں سرایت کر جاتی ہے اور داخلی طور پر فرد کے ریزہ ریزہ بکھرنے کی آڑی ترچھی تصویریں ترتیب دے جاتی ہے۔ واقعہ کی یکسانیت یا مرکزیت کے باوجود جدیدیت پسند شاعر اپنے اپنے ذہن و مزاج کے لحاظ سے اس کا اثر لیتے ہیں۔ ان کا ردعمل بھی الگ الگ زاویوں سے ہوتا ہے۔ شاعر اور سماج کے درمیان ہم آہنگی نہیں ہو پاتی اور نہ سماج سے اس کی اپنی ذات کی پہچان ہو پاتی ہے تو اس میں برگشتگی پیدا ہوتی ہے اور برگشتگی اس کی نفسیات پر ایسا اثر ڈالتی ہے کہ وہ بیگانگی، علاحدگی، اکیلے پن اور تنہائی کے احساسات سے دوچار ہوتا ہے اور کبھی کبھی گوشہ نشینی اختیار کر کے سکون حاصل کرتا ہے۔ یہ سب داخلی عمل کے مرحلے ہیں جنہیں شاعروں نے طے کیا اور اپنے اپنے لفظوں میں جلوہ گر بھی کیا

مگر یہاں کی بستیوں میں کون ہے؟
جو آس کی شکھا لیے، سپاٹ سرد ریت پر کھڑا رہے
کوئی نہیں
کوئی نہیں
تو کیوں نہ ان بجھی دشاؤں کو سمیٹ لیں!
تو کیوں نہ اور سو رہیں!

(میں سو گیا۔ احمد ہمیش)

اے رنگ برنگی شامو
کیوں دامن میرا تھامو
تم آوازوں کی بستی
میں سناٹوں کا صحرا
تم بہتے وقت کی موجیں
پل بھر میں گذر جاؤ گی
میں سوچ کا پیاسا پتھر
آپ اپنی ہی گہرائی میں
ڈوبا ہوا رہ جاؤں گا (شہاب جعفری)

شاعروں نے اپنے حسّی تجربوں کے دوسرے رنگوں کی بھی ترجمانی کی ہے اور شعری پیکروں کی تخلیق کی ہے۔ حسی اظہار کے اس رجحان کا تعلق پیکریت (Imagism) سے ہے۔ ذیل کا نمونہ دیکھا جا سکتا ہے :

تمہاری رگوں میں میری رگوں کی طرح
کتنی صدیوں کا خوں، کتنی نسلوں کا خوں موج زن ہے
اور یہ ساری نسلیں، شکستہ مگر اونچی دیوار کی طرح استادہ ہیں
یونہی کب تلک فون پر بات کرتے رہیں گے
یونہی فاصلہ جسم کا، لمس کا
ایک رشتہ فقط صوت و آواز کا
یہ رشتہ بھی حصہ ہے گونگے سفر کا
جو کب ٹوٹ جائے
کسے یہ پتا ہے!
کاش یہ رشتۂ صوت و آواز ہی دائمی ہو
کہ گونگے سفر کے سبھی سلسلے عارضی ہیں (مظہر امام)

تحت الشعور اور لاشعور میں موجود بہت ہی موہوم سچائیوں اور واہموں کی ملی جلی کیفیت کے اظہار میں ابہام اور اشاریت کا پیدا ہونا فطری ہے۔ فی نفسہٖ ایسے تجریدی خیال زمینی علاقہ نہیں رکھتے۔ ذہن کی کسی تہہ میں پُر اسرار طریقے سے آ جاتے ہیں اور کبھی کبھی اچانک کہیں ظاہر ہوتے ہیں۔ شاعروں نے بسا اوقات اپنے خیال کا ہلکا پھلکا عکس پیش کیا ہے۔ ان کی بنت میں ماورائے حقیقت پسندی (Surrealism) کا میلان بھی شامل ہو گیا ہے۔ مثال کے طور پر نظم کا یہ حصہ درج ہے:

سورجوں کی بستیوں میں
ہر طرف سورج ہی سورج
میرے اپنے لوگ
میری آتما کے ان گنت انجانے روپ
اک دوسرے سے اس قدر سب آشنا
سارے روپ اک دوسرے میں نور کی مانند یوں تحلیل
جیسے میرے اندر میرا میں (وجدان۔ شہاب جعفری)

یہاں بات نئی، انوکھی اور پر اسرار ہے۔ علامتی اور اشاراتی اظہار اسے مزید مبہم بنا دیتا ہے۔ جس کی بنا پر وہ تخلیقی تاثر مرتسم نہیں ہوتا جو قاری کے وجود میں ایک پر مسرت حسّی ارتعاش پیدا کر دے اور معنویت کی روشنی پھوٹے۔

جدیدیت پسند شاعروں نے ہیئتی سطح پر آزاد نظم میں اپنی عصری حسیت کا جادو جگایا۔ اس کے علاوہ بصری نظم (Concrete poetry) اور نثری نظم (Prose-poem) کی ہیئتوں میں بھی تجربے کیے۔ آزاد نظم اور نثری نظم لکھنے کا چلن اردو میں بہت پہلے سے تھا۔ حلقۂ ارباب ذوق کے شاعروں نے پابند کے ساتھ ساتھ آزاد نظمیں بھی کہی تھیں پھر ترقی پسندوں نے بھی اسے اپنایا۔ نثری نظم رومانی اور ترقی پسند شاعروں کے ذریعے ارتقا پذیر ہوئی تھی۔ لیکن یہ امر ملحوظ رہے کہ آزاد نظم اور نثری نظم کی ہیئتوں کو تقویت اور استحکام جدیدیت پسند شاعروں نے دیا ہے۔ بہر حال کنکریٹ نظم کا یہ نمونہ زیر نظر رہے:

بدن کے کیپسول میں
عجیب سا سفوف ہے بھرا ہوا
کثیف ہے لطیف ہے غلیظ ہے
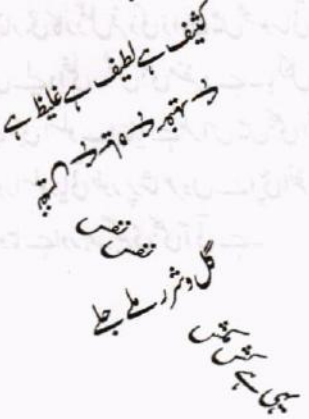
جو کش مکش تمام ہو
بدن سوائے خول کے نہیں ہے کچھ
خلا
خلا
خلا

(خلا۔ زرینہ ثانی)

یہاں چھوٹے بڑے مصرعے یا شعری سطریں بغیر کسی ترتیبی حسن کے اوٹ پٹانگ طور پر لکھی گئی ہیں جو خیال کی لہروں اور شعور کی رو کے اُتار چڑھاؤ اور ابھرنے ڈوبنے کی مثال ہے۔ اس کے پس پردہ زندگی کی بے ترتیبی، بے معنویت اور بے سمتی منعکس ہو رہی ہے۔ ان عوامل کی بصری تصویر لفظوں کی آڑی ترچھی سجاوٹ سے ظاہر کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ہیئت کے اس تجربے میں یہ موضوع در آیا ہے کہ زندگی کے اتار چڑھاؤ اور کش مکش ہی کی بنیاد پر وجود قائم ہے اور اس کے بغیر وجود بالکل خلا کی طرح بے معنی ہے۔

نظمیہ شاعری میں اس طرح کے ہیئتی تجربے تو ہوئے مگر اردو شاعری کے مزاج میں یہ ضم نہیں ہو سکے اور تاریخ کا حصہ بن کر محفوظ ہو گئے۔ اس کے مقابلے میں نثری نظم آہستہ آہستہ پھلنے پھولنے لگی۔ اس کے ذریعے قدیم عروضی آہنگ کو توڑنے اور ایک متبادل آہنگ بنانے کی سعی کی گئی ہے۔ لفظوں، سطروں اور پیراگراف کی ترتیب سے آہنگ بنایا گیا اور کسی قدر کامیابی بھی ملی مگر نغمگی اور شعریت کی کمی کھٹکتی رہی۔ اس نظم کے مطالعے سے یہ اندازہ کیا جا سکتا ہے:

تمہارا شعلہ بجھ چکا ہے
اس لیے نہیں کہ ہوا تیز تھی اور مخالف
بلکہ اس لیے کہ تم نے
اسے ہوا سے دور رکھا

('ساتواں در' کی ایک نظم۔ شہریار)

اعجاز احمد، احمد ہمیش، حسن شہیر اور افتخار جالب وغیرہ نے بھی اس دور میں نثری نظمیں کہیں اور جدیدیت کے مخصوص علامتی اور اشاراتی انداز اظہار میں عصری حسیت سمونے کی کوشش کی۔ ہیئتی سطح پر مختصر، اوسط اور طویل ہر طرح کے تخلیق پارے وجود میں آئے۔ جن میں مختصر نثری نظمیں قدرے موثر ثابت ہوئیں۔

جدیدیت کے دور میں وجودیت کے تناظر میں ابھرنے والے تمام موضوعات نظموں میں داخل ہوتے گئے اور تخلیق کی چمک دمک میں اضافہ کرتے رہے۔ احساس تنہائی' بیگانگی' اجنبیت' خوف' بے سمتیت' لایعنیت' انفعالیت وغیرہ نظمیہ افق پر چھائے رہے۔ دراصل یہ دور ہی داخلیت پسندی کا ہے۔ اس میں فکری سفر ظاہر سے باطن کی طرف تھا۔ تمام مظاہرات خارجی کا ردعمل فرد کی ذات میں محسوساتی سطح پر ہوتا ہے۔ ہر فرد کی محسوساتی سطح اس کے ذہن اور مزاج کے مطابق ہے نیز ہر مظہر کو دیکھنے کی اپنی نگاہ ہے اس لیے داخلی ردعمل بھی منفرد ہے۔ بالکل اسی طرح جدیدیت کی ایک پہچان علامتی اور اشاراتی اسلوب ہے۔ ہر تخلیق کار اور شاعر نے اپنے اظہار کے لیے یہی اسلوب اپنایا ہے مگر اس میں بھی انفرادی تخلیق کار کی خصوصیت موجود ہے۔ اس لیے یہ دعویٰ کرنا درست ہے کہ جدیدیت پسند نظموں میں موضوعاتی اور اسلوبیاتی طور پر شاعروں نے اپنی انفرادی چھاپ چھوڑی ہے جس سے نظمیہ سرمائے میں اکتا دینے والی یکسانیت نہیں آتی ہے بلکہ تنوع اور تلون بھی پیدا ہوتا ہے اور ہمہ گیری بھی آتی ہے۔

اپنی معلومات کی جانچ

1. دو جدیدیت پسند نظم نگاروں کے نام بتائیے۔
2. نظم کا ایک اہم موضوع بتائیے۔
3. پانچ جدیدیت پسند نظموں کے نام لکھیئے۔
4. جدیدیت پسند نظم کی اسلوبیاتی خوبیوں پر روشنی ڈالیئے۔
5. دور جدیدیت میں نظم کی کون کون سی ہیئتیں سامنے آئیں؟
6. بصری نظم کا تجربہ کیوں ناکام ہوگیا؟
7. جدیدیت پسند نظموں کی مجموعی شناخت کیسے ہوگی؟

29.6 خلاصہ

بیسوی صدی انقلاب اور تغیر کی صدی تھی اس کے وسط تک سارے عالم میں سیاسی' سماجی' اقتصادی اور صنعتی تبدیلیاں آئیں۔ اقتدار کی تبدیلیوں' آزادی کے نعروں اور جنگ کے دھماکوں سے فضا گونجنے لگی۔ روس پر سرخ پرچم لہرانے لگا۔ دو عالمی جنگیں لڑی گئیں۔ ہندوستان آزاد ہوا' پاکستان وجود میں آیا۔ چین میں عوامی حکومت بنی' برصغیر میں جنگیں ہوئیں۔ مذہبی اور لسانی ٹکراؤ ہوا۔ غرض ہر چہار طرف ایسے حالات پیدا ہوگئے کہ ترقی پسند ادبی تحریک میں انتشار پیدا ہوگیا۔ سماجی حقیقت نگاری کا زور ٹوٹ گیا۔ فرد خارجی دنیا سے بیزار ہوکر داخلی دنیائیں آباد کرنے لگا۔ سماجی اور کائناتی حقائق اور عوامل کی بازیافت ذات کے حوالے سے ہونے لگی۔ اس دوران یوروپی فلسفیوں کے افکار سے اس رجحان کے پھلنے پھولنے میں مدد ملی۔ جس کے نتیجے میں عدم تحفظ' خوف' گمنامی' تنہائی' بے چہرگی' لایعنیت' فراریت' انکاریت وغیرہ جیسے احساسات عام ہوتے گئے اور شعر وادب میں ان کا داخلہ تیزی سے ہونے لگا۔ شعر وادب کے اسی رجحان کو جدیدیت کا نام دیا جاتا ہے۔

اسپنسر' بارتھ' اسٹاک مان' ارنسٹ ماخ' ہیوم' فرائڈ' ینگ' کروچے' سارتر وغیرہ کے نظریات کی جدیدیت کے رجحان میں بڑی اہمیت ہے۔ معرفت پسندی' انفرادیت پسندی' ماورائے حقیقت پسندی' ماورائیت' انکاریت' پیکریت' تاثریت' نراجیت' لایعنیت' لاشعور' اجتماعی لاشعور وغیرہ مقبول نظریے ہیں جو فرد کی ذہنی کیفیت' نفسیاتی کشمکش اور محسوساتی نزاکتوں پر مبنی ہیں۔ ان ہی کی بالکل ذاتی اور انفرادی ترجمانی سے نئی حسیت عبارت ہے۔

ابتداً جدیدیت پسند شاعروں نے بالخصوص غزل گوؤں نے اردو کی شعری روایت شکنی کرتے ہوئے انوکھا اور البیلا علامتی اور اشاراتی اسلوب اختیار کیا۔ اس میں خاصا ابہام بھی تھا اور ناپسندیدہ الفاظ وتراکیب بھی تھے۔ ندا فاضلی' شمس الرحمٰن فاروقی' شکیب جلالی' محمد علوی وغیرہ نے اس طرح کے اشعار کہے تھے مگر جلد ہی یہ لہر ختم ہوگئی اور جدیدیت کا متعدل غزلیہ رنگ ابھرنے لگا۔ موضوعات کے ساتھ ساتھ شعری اسلوب میں بھی خوشگوار تبدیلی کی گئی۔ موسیٰ وطور' مریم وعیسیٰ' یوسف وزلیخا' شیریں وفرہاد' قفس وآشیاں' کعبہ وکلیسا' صیاد وگلچیں' ساقی ومیخانہ وغیرہ جیسی تلمیحیں' استعارے اور اشارے سے جان بوجھ کر گریز کیا گیا اور ان کی جگہ بالکل سامنے کی زمین سے جڑے ہوئے تلازمے' اشارے اور علامتیں وضع کی گئیں۔ سورج' چاند' رات' اندھیرا'

اجالا' دھوپ' پرچھائیں' سمندر' جھیل' کشتی' جزیرہ' شہر' گھر' بستی' پتھر' تتلی' مچھلی وغیرہ اس کثرت سے استعمال ہوئے کہ جدید شعروں کی پہچان بن گئے۔ یہاں تک کہ عشقیہ معاملے اور مرحلے بھی ان نئے لفظوں سے بننے والے اسلوب میں بخوبی سمانے لگے۔ ان ہی میں تخلیقی نادرہ کاری کا بھرپور مظاہرہ ہونے لگا۔ مظہر امام' مظفر حنفی' ناصر کاظمی' شہریار' شاذ تمکنت' معین تبسم' بشیر بدر' محمد علوی' احمد فراز' پرکاش فکری' شہاب جعفری' سلیم احمد' شکیب جلالی' آشفتہ چنگیزی' ساقی فاروقی' افتخار عارف' محمد علی اثر' باقر مہدی' کمار پاشی' لطف الرحمٰن' خلیل الرحمٰن اعظمی وغیرہ نے اپنے عہد کے فکر و احساس کی بڑی خوبصورت ترجمانی کی ہے۔ زندگی کی تہہ داری' پیچیدگی' لمحہ بہ لمحہ بدلتا رنگ اور ظاہر اور باطن کی آویزش سے جو جمالیاتی اور ملفوظی چنگاریاں پھوٹتی ہیں' وہ غزلیہ شاعری میں جان ڈال دیتی ہیں۔ نئی لفظیات' ڈکشن' علامتیں' استعاروں اور اشاروں سے حسّی تجربوں کا ایک نگارخانہ سج جاتا ہے اور اردو غزل کے مزاج و معیار میں خوشگوار اضافہ ہوتا ہے۔

جدیدیت پسند غزلوں کی طرح نظمیں بھی نئی حسیت کی کہکشاں سے آراستہ ہیں۔ علامتی' استعاراتی اور اشاراتی تسلسل اور ارتقا ان کی معنویت میں کئی دلفریب موڑ لاتا ہے اور اختتامیہ کے استفہام یا انکشاف کی زمین ہموار کر دیتا ہے۔ افتخار جالب' وزیر آغا' قاضی سلیم' بلراج کومل' منیر نیازی' عمیق حنفی' احمد ہمیش' مظہر امام' زرینہ ثانی' شہریار وغیرہ نے نظمیہ شاعری میں نئی حسیت کی روح پھونکی ہے اور اسے نئے افق سے آشنا کرایا ہے۔ تجربے کے طور پر بصری اور نثری نظمیں بھی لکھی گئیں مگر ان کا رواج نہ ہو سکا۔ آزاد نظم کی ہیئت ہی چھائی رہی۔ مجموعی طور پر دیکھا جائے تو جدیدیت پسند غزلوں اور نظموں میں نئے انسان کے فکری سفر کے پر اثر علامتی اور اشاراتی نشانات ملتے ہیں۔ یہ سفر ظاہر سے باطن کی طرف ہوتا ہے اس لیے تمام مظاہرات خارجی کا ردعمل فرد کی ذات میں محسوساتی سطح پر ہوتا ہے اور اس داخلی ردعمل میں بڑی گونا گونی اور تنوع ہے۔ یکساں خیالات اور احساسات کا شعری عکس بھی انفرادی طور پر ابھرا ہے۔ اسلوبیاتی لحاظ سے شاعروں نے اپنی چھاپ چھوڑی ہے اور شاعری کو ہمہ جہت' ہمہ رنگ اور وسیع کرتے ہوئے ایک نئی شعری روایت بنائی ہے جو شاعری کی تاریخ میں سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔

29.7 نمونۂ امتحانی سوالات

ذیل کے سوالوں کے جواب تیس تیس سطروں میں دیجیے:

1. جدیدیت کے زیر اثر اردو غزل میں کیا تبدیلی آئی؟ مثالوں کے ساتھ لکھیے۔
2. جدیدیت پسند نظموں کی خصوصیات بیان کیجیے اور مثالیں دیجیے۔
3. جدیدیت سے اردو شاعری میں کن سطحوں پر تبدیلی آئی؟ مفصل لکھیے۔
4. جدیدیت میں کیسے کیسے ہیئتی تجربے ہوئے؟ مثال دے کر واضح کیجیے۔

ذیل کے سوالوں کے جواب پندرہ پندرہ سطروں میں دیجیے:

1. جدیدیت پسند شاعری کے محرکات کی تفصیل لکھیے۔
2. جدیدیت کے رجحان میں کن یوروپی مفکروں اور فلسفیوں کے کون کون سے نظریے شامل ہیں؟
3. جدت پسندی یا فیشن پرستی کیا ہے؟ شعری مثالوں سے واضح کیجیے۔

29.8 فرہنگ

مطمحِ نظر = مرکزِ نظر' اصلی مقصد

منطقہ = دائرہ' حلقہ

داخلی شکست و ریخت = جذباتی اور احساساتی اتار چڑھاؤ

علامت = symbol

استعارہ = Metaphor

اشارہ = Reference

تلمیح=Allusion کسی تاریخی یا نیم تاریخی بات کا ایک دو لفظ میں حوالہ

حسیت=Sensibility

شعری عکس=شاعرانہ آئینہ داری

ملفوظی=لفظوں میں چھپا ہوا

برگشتگی=Defiance' انحراف

شعری روایت=شاعری کے متعلقات کا رواج

29.9 سفارش کردہ کتابیں

1. شمیم حنفی — جدیدیت کی فلسفیانہ اساس
2. لطف الرحمٰن — جدیدیت کی جمالیات
3. مظفر حنفی — جدیدیت۔ تجزیہ و تفہیم
4. شمیم حنفی — نئی شعری روایت
5. بشیر بدر — آزادی کے بعد کی غزل کا تنقیدی مطالعہ
6. وزیر آغا — نظم جدید کی کروٹیں
7. فضیل جعفری — چٹان اور پانی

اکائی: 30 جدیدیت اور اُردو نثر

ساخت

30.1 تمہید

30.2 پس منظر

30.3 آغاز

30.4 افسانہ

30.4.1 داستانوی فضا

30.4.2 علامتی اظہار

30.4.3 تجریدوابہام

30.5 تنقید

30.6 خلاصہ

30.7 نمونۂ امتحانی سوالات

30.8 فرہنگ

30.9 سفارش کردہ کتابیں

30.1 تمہید

جدیدیت ایک رجحان ہے۔ اس رجحان نے اردو نثر پر گہرا نقش چھوڑا۔ اس اکائی میں ہم یہ جاننے کی کوشش کریں گے کہ یہ رجحان کس قسم کا تھا' ادب میں یہ کب رونما ہوا اور اس نے ادب پر کیا اثر ڈالا نیز افسانے اور تنقید میں جو بہت بڑی تبدیلی آئی اس کے بارے میں ہم واقفیت حاصل کریں گے۔

30.2 پس منظر

جدید سائنس اور ٹکنالوجی نے بے پناہ ترقی کی ہے جہاں وسائل کا دائرہ کار وسیع ہوا ہے وہیں دنیا قومی و ملکی مسائل کے ساتھ بین الاقوامی مسائل سے بھی دوچار ہے۔ آدمی ایک طرف بین الاقوامی انسانی برادری کا رکن ہے اور بین الاقوامی سماج میں جی رہا ہے اور دوسری طرف صنعتی تمدن کی وجہ سے اس کی آدمیت ختم ہوتی جارہی ہے۔ انسانی رشتے اور قدریں میکانکی ہوتی جارہی ہیں۔ آدمی کی شناخت ختم ہوتی جارہی ہے۔ ہر فرد اپنے حصار میں گم ہے۔ مشترک خاندان اور باہمی ذاتی رشتے سے کٹے ہوئے لوگوں کے احساس تنہائی و محرومی میں ناقابل برداشت اضافہ ہوا ہے۔ ہر شعبۂ زندگی میں حد سے زیادہ مقابلہ و مسابقت نے انسان کو خودغرض بنادیا ہے۔ اخوت اور ایثار جیسے الفاظ بے معنی ہوگئے ہیں۔ مشینوں کی صحبت میں انسان بھی

مشین ہوتا جارہا ہے۔ بڑے ملوں میں کام کرنے والے مزدور مکمل تخلیق کی سیرت سے بے گانہ ہیں۔ اگر کوئی مزدور کسی مشین کا ایک پرزہ بناتا ہے تو کام کے تمام اوقات میں وہ صرف وہی پرزہ بناتا ہے۔ اس طرح وہ پوری مشین بنانے کی تخلیقی مسرت سے محروم ہے۔ بار بار ایک ہی عمل (Process) کی تکرار سے اکتاہٹ' بے زاری' بوریت' یکسانیت اور بے کیفی کا احساس جڑ پکڑتا ہے۔ اس کے اندر تنہائی' اکیلا پن' جلاوطنی' بیگانگی اور اپنی جڑ سے اُکھڑنے کا احساس گہرا ہونے لگتا ہے۔ وہ محسوس کرتا ہے کہ بھیڑ میں بھی وہ اکیلا ہے۔ گھر کے افراد کے بیچ تنہا ہے' وہ کسی کا نہیں ہے اور کوئی اس کا نہیں ہے۔ اس کے اندر گھٹن کا احساس بڑھتا جارہا ہے۔

موجودہ دور میں انسان ہر لمحہ مٹ جانے کے خوف سے پریشان ہے۔ مذہب' زبان' رنگ' قوم وملّت اور نسل کی بنیاد پر ساری دنیا میں فسادات' تصادم اور خوں ریزی کا ایک سلسلہ بڑے پیمانے پر جاری ہے۔ نسلی تعصّبات کے بے بنیاد احساس برتری نے فرد اور ملت دونوں ہی کو نفرت و حقارت اور آزردگی وحسد کا نشانہ بنا رکھا ہے۔ ضمیر فروشی' حق تلفی' جھوٹ' بے ایمانی' بزدلی اور مکاری کو سیاست اور مصلحت کے اہم معنی قرار دینے کا عالم گیر رجحان اس عہد کے کھوکھلے پن' سطحیت اور خودغرضی کا آئینہ دار ہے۔

بڑی طاقتوں نے جنگ مسلط کردی ہے۔ جنگ اور جنگ کے ماحول کے باعث اسلحہ سازی میں خطرناک مسابقت نیز مسلسل ایٹمی دھماکوں نے فضا' سمندر اور زمین کو اس طرح آلودہ و پراگندہ کردیا ہے کہ اس کا اثر موسموں کی سمت و رفتار پر تو پڑا ہی زمین کی بنیاد بھی ہل گئی ہے۔

کثرتِ آبادی کا مسئلہ پیچیدہ ہوتا جارہا ہے۔ دولت کی فراوانی کے امکانات کے ساتھ ساتھ غربت اور افلاس' ذات پات' رنگ ونسل اور قومیت کی تفریق کی بنا پر ذرائع معاش اور مواقعۂ روزگار کی کمی نے بے کاری' سماجی دباؤ' گھٹن اور تشدد کی نفسیات کو بڑھاوا دیا ہے۔

انتشار و بحران کی بنیادی وجہ سائنس اور ٹیکنالوجی کے مقابلے میں روحانی اور اخلاقی قدروں کی سست روی ہے۔ موجودہ بحران کو دور کرنے کے لیے نیا اخلاقی نظام پوری طرح سامنے نہیں آیا۔

یہ وہ پس منظر ہے جس کی وجہ سے جدیدیت کے رجحان کا آغاز ہوا۔ جدیدیت کی جڑیں' وجودیت کے فلسفے سے ملتی ہیں۔ مغرب میں پہلی جنگِ عظیم کے بعد ہی یہ نقطۂ نظر مقبول ہوا۔ اردو میں ترقی پسند تحریک کے زوال کے دور میں اس طرز فکر کو مقبولیت حاصل ہوئی۔ پہلی جنگ عظیم کے بعد سامراجی آمریت اور تحریکاتِ آزادی کی وجہ سے ہمارے ملک میں اشتراکی نقطۂ نظر کا استقبال کیا گیا لیکن تقسیم ہند کے خونین ڈراموں اور عالمی سطح پر انسانی ہلاکتوں اور سرمایہ داری کے بول بالے کے باعث ترقی پسند تحریک کا اثر بتدریج کم ہوتا گیا۔ ترقی پسند تحریک کے دور زوال ہی میں وجودیت و تجریدیت کے رجحان نے اپنی جگہ بنانی شروع کی۔ یہاں تک کہ 1960ء کے آس پاس ایک نیا رجحان سامنے آیا جسے جدیدیت سے موسوم کیا گیا۔ اس نئے رجحان کا خمیر وجودیت اور تجریدیت سے تیار ہوا۔

وجودیت عہد زوال کا فلسفہ ہے۔ اس فلسفے کو سمت و رفتار عطا کرنے میں کانٹ' ہیگل' ڈیوڈ ہیوم اور سارتر کا اہم حصہ ہے۔ وجود کی عام تعریف یہ ہے کہ کسی چیز کا کسی زمانے میں کسی جگہ پر ہونا یہ اس شئے کے وجود سے عبارت ہے۔ وجودیت پسند مفکرین اس تعریف کو رد کرتے ہیں ان کے نزدیک وجود سے مراد ہر لمحہ کچھ ہوتے رہنا' کچھ بنتے رہنا' وجود کا مفہوم ''یہ ہے'' ہو ہی نہیں سکتا بلکہ ہو رہا ہے' بن رہا ہے' بننے کا عمل جاری ہے۔ ہر لمحہ ہر گھڑی یہ پروسس روبہ عمل ہے۔ اس اعتبار سے صرف آدمی کا وجود ہے۔ آدمی ہی وہ وجود ہے جو ہر لمحہ بننے اور ہونے کے عمل سے گزرتا ہے۔ وجودیت کا فلسفہ صرف آدمی یا فرد سے بحث کرتا ہے۔ وہ بھی منفرد آدمی سے۔ جس کو ہائیڈگر Dascien کہتا ہے اور سارتر انسانی حقیقت Human Reality اور کرگے گارڈ انسانی وجود Human Existence کہتا ہے۔

وجودیت کا فلسفہ انسان کی داخلیت کے ارتقا کو پیش کرتا ہے۔ فرد کے وجود کو سمجھنے کے لیے داخلیت کی گہرائیوں میں اترنا ضروری ہے۔ فرد اپنے احساس وادراک کی روشنی میں دیکھتا ہے کہ داخلیت کا ارتقا کن راہوں اور وادیوں کا رہین منت ہے۔ داخلیت کے تجربے میں فرد اپنے آپ کو اکیلا محسوس کرتا ہے۔ اکیلے پن میں پہلا احساس اپنے وجود کا ہوتا ہے۔ اکیلے پن کے احساس سے فرد کو دکھ ہوتا ہے۔ اکیلے پن کا احساس آزادی کا

احساس دلاتا ہے۔ آزادی کی وجہ سے فرد کو قوت فیصلہ کی آزادی حاصل ہوتی ہے اور قوت ارادی کا احساس بھی ابھرتا ہے لیکن انسان محسوس کرتا ہے کہ وہ محدود ہے اس کی صلاحیتیں اور امکانات محدود ہیں۔ اپنی خواہش اور منشا کے بغیر وہ کچھ نہیں کر سکتا۔ خدا کی مرضی اور رحم و کرم کے بغیر ایک قدم بھی چلنا دشوار ہے تو اپنے محدود ہونے کے احساس سے اسے دکھ ہوتا ہے۔

جب فرد سوچتا ہے کہ دنیا میں ہر شئے ممکن ہے وہ کوئی بھی کامیابی حاصل کر سکتا ہے۔ لیکن عملی سطح پر تجربے سے دو چار ہونے کے بعد اسے لگتا ہے کہ اسے امکانات کے مقابلے میں بہت کم حاصل ہوا ہے یعنی جو ہے اور جو ہونا چاہیئے میں کوئی ہم آہنگی اور نسبت نہیں ہے تو اسے دکھ ہوتا ہے۔

فرد جب محسوس کرتا ہے کہ دنیا میں ہر شئے پہلے سے متعین اور طے شدہ ہے۔ اس کے بس میں کچھ نہیں ہے۔ اس کی صلاحیتیں، توانائی اور طاقت پہلے سے طے شدہ اور مقررہ اصولوں کے سامنے مات کھا جاتی ہے اس کی تقدیر پہلے سے لکھ دی گئی ہے اس سے اسے فکر ہوتی ہے۔

فلسفۂ وجودیت میں ساری باتوں کی بنیاد فرد کا شعورِ ذات ہے۔ فرد سوچتا ہے کہ وہ ادھورا ہے۔ اس میں کہیں کوئی کمی رہ گئی ہے۔ اس کی زندگی میں ایک خلا ہے۔ اس میں نفی کا احساس جاگتا ہے اور اس سے دکھ ہوتا ہے۔ سب سے بڑا دکھ موت کا احساس ہوتا ہے کہ سب کچھ ختم ہونے والا ہے۔ یہ دکھ اسے تنہائی کا احساس دلاتا ہے۔ موت کا احساس فرد کے اندر خوف و دہشت اور پریشانی و بے قراری پیدا کرتا ہے۔ اصل حقیقت تو موت کی ہے اور وہ ابدیت کے ایک خیالی اور قیاسی تصور میں جی رہا ہے۔ وہ ایک وہم ایک گمان کے سہارے جی رہا ہے۔

جدید لکھنے والے فلسفۂ وجودیت کو سب سے موثر قوت تسلیم کرتے ہیں۔ جدید افسانہ نگاروں کے یہاں ایسے ہی رجحانات ملتے ہیں جیسے ڈر، خوف، ذہنی انتشار، ہجرت، جلاوطنی، سفر، داخلی و ذہنی کیفیات، کرب، تنہائی، احساس محرومی و مایوسی، احتجاج اور ماضی کی بازیافت کھوئے ہوئے انسانوں کی تلاش وغیرہ۔

یاسمین فاطمہ کے مطابق 1960ء کے لگ بھگ جدید ذہن کے ادیبوں نے ترقی پسند مصنفین کی جماعت بندی اور نظریاتی وابستگی کے خلاف آواز بلند کی۔ انہوں نے کہا کہ ادیب کی وابستگی مخصوص سیاسی جماعت یا نظریے سے نہیں بلکہ اپنی ذات سے ہونی چاہیئے۔ ادیب جو کچھ محسوس کرتا ہے اسے اپنی تخلیقات میں پیش کرے۔ جدید لکھنے والوں نے فرد کو انبوہ سے نکال کر اس کی ذات کے مسائل کا جائزہ لیا۔ ساتھ ہی ساتھ اپنے عہد کی حسیت کی ترجمانی کی، عصری حسیت اپنے عہد کی ایسی صورت حال سے آگاہی کا نام ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ ادیب اور فن کار اپنے سماجی اور معاشرتی مسائل کے سیاسی، معاشرتی، محرکات سے گہری واقفیت رکھیں اور جدید ٹکنالوجی سے پیدا ہونے والے مسائل کا بھی انہیں شعور ہونا چاہیئے"۔ (اردو افسانے میں عصری حسیت)

آل احمد سرور نے 1967ء میں "جدیدیت اور ادب" کے موضوع پر شعبۂ اردو، علیگڑھ یونیورسٹی کی جانب سے ایک سمینار منعقد کروایا تھا جس میں پیش کیے گئے مقالات کا انتخاب "جدیدیت اور ادب" کے نام سے اگست 1969ء میں شائع ہوا۔ اس میں جدیدیت کی تعریف مختلف انداز و اسالیب میں کی گئی ہے۔

آل احمد سرور کے الفاظ میں جدیدیت آدمی کی تلاش کا نام ہے۔ جدید دور میں یہ کسی بھی آئیڈیالوجی کے خلاف ردِ عمل ہے۔ آج کا ادیب اس غلامی کو قبول کرنا نہیں چاہتا۔ وہ انسانی زندگی کو آزادانہ دیکھنے اور برتنے کا حق مانگتا ہے۔ اسی کا نام جدیدیت ہے۔ وحید اختر کہتے ہیں "جدیدیت کی مختصر ترین تعریف یہ ہو سکتی ہے کہ جدیدیت اپنے عہد کی زندگی کا سامنا کرنے اور تمام خطرات اور امکانات کے ساتھ برتنے کا نام ہے۔ جدیدیت ایک مستقل عمل ہے جو ہمیشہ جاری رہتا ہے۔ وحید اختر جدیدیت کو جدلیاتی مادیت یا ترقی پسندی کی توسیع سے تعبیر کرتے ہیں۔ شمس الرحمٰن فاروقی تمام فلسفوں اور نظریوں کی حدود توڑنے کا نام جدیدیت بتاتے ہیں۔ ناوابستگی اس کی وہ خصوصیت ہے جو اسے پچھلے تمام رویوں سے ممتاز کرتی ہے۔ جدیدیت نہ صرف انحراف بلکہ تنسیخ کا نام ہے۔ جدیدیت نے کھل کر تنسیخ کا اظہار کیا اور وجود میں آئی۔ ڈاکٹر محمد حسن جدیدیت کو رومانیت کی توسیع اور صحت مند جدیدیت کو ترقی پسندی کی توسیع سمجھتے ہیں۔ بعض نقاد جدیدیت کا سلسلہ حالی، نظیر اکبر آبادی اور محمد حسین آزاد سے ملاتے ہیں۔ ان کے علاوہ

ڈاکٹر تبسم کاشمیری کہتے ہیں کہ ہر عہد میں جدیدیت کے اپنے معنی ہوتے ہیں اور جو اس دور کے سماجی عمل سے مرتب ہوتے ہیں لہذا ہر عہد اپنی مخصوص جدیدیت رکھتا ہے۔ بعض نقاد جدید طرزِ احساس اور زندگی کے بدلتے ہوئے مسائل کے ادراک کو جدیدیت سمجھتے ہیں۔ بعض صرف فارم کے انوکھے تجربے تک جدیدیت کو محدود رکھتے ہیں۔

ان تمام مباحث کے بعد جدیدیت کی آسان تعریف یہ ہوسکتی ہے کہ جدیدیت ایک رویے اور اندازِ فکر کا نام ہے۔ جدید کے معنی یہ ہرگز نہیں ہیں کہ ہر نقشِ کہن کو مٹا دیا جائے یا ہر روایت کو ختم کر دیا جائے۔

جدیدیت ایک ادبی اصطلاح ہے اس کا اطلاق 1957ء کے بعد کے ادب پر ہوتا ہے۔

اپنی معلومات کی جانچ

1. موجودہ دور میں انسان کو ہر لمحہ کس بات کا خوف ہے؟

(ا) لٹ جانے کا (ب) مٹ جانے کا (ج) کٹ جانے کا (د) اجڑ جانے کا

2. جدیدیت کا خمیر کس سے تیار ہوا؟

(ا) وجودیت اور تجریدیت سے (ب) حقیقت پسندی اور اشتراکیت سے

(ج) رومانیت سے (د) خارجیت کے تصور سے

3. جدید لکھنے والوں نے کس کے خلاف ردعمل کا اظہار کیا؟

(ا) وجودیت کے (ب) نظریاتی وابستگی کے (ج) عصری حسیت کے (د) ذہنی انتشار کے

30.3 آغاز

1936ء سے 1956ء تک ترقی پسند تحریک کا دور رہا۔ تقسیم ہند کے المیے نے اس تحریک کو کمزور کر دیا۔ انسانیت سوز واقعات اور ان کا ردعمل، ہجرت کا کرب نیز معاشرتی انتشار نے نظریاتی وابستگی اور جدلیاتی مادیت کے تصور کو پسِ پشت ڈال دیا۔ 1947ء سے 1957ء تک ترقی پسندوں اور ان کے بعد کے ادیبوں نے تقسیم ہند، فرقہ وارانہ فسادات، ہجرت اور جاگیردارانہ معاشرے کے زوال کو موضوع بنایا۔ اس ادب نے جلاوطنی، بے زمینی، بے جڑی اور بے تعلقی کے احساس کو زمین فراہم کی۔ انتظار حسین اور قرۃ العین حیدر نے ان موضوعات کو خوب برتا۔ پروفیسر گوپی چند نارنگ لکھتے ہیں ''دونوں کے فن کی پہچان تقسیم کے تہذیبی المیے سے پیدا ہونے والے مسائل کے ذریعہ ہوئی ..... قرۃ العین حیدر صدیوں کے رشتوں، ماضی کی بازیافت اور وقت کے تسلسل کو گرفت میں لینے میں اپنی نظیر نہیں رکھتیں، انتظار حسین کا فن، فضا آفرینی کا فن ہے۔ وہ ماضی کی روح اور انسانی وجود کے اس حصے کی تلاش میں سرگرداں ہیں جو کٹ کر ماضی میں رہ گیا ہے اور جس کے بغیر انسانی وجود مکمل نہیں'' (اردو افسانہ روایت اور مسائل ص ۷۳)۔ قرۃ العین حیدر کے یہاں وقت کا تصور اور اس کا جبر موضوع ہے۔ انتظار حسین آج کے انسان کے مسائل کا رشتہ کتھا، حکایت اور جاتک کہانیوں سے جوڑتے ہیں۔ آزادی کے بعد لکھنے والوں کی ایک ایسی نسل سامنے آئی جو کسی نظریاتی یا ادبی وابستگی کے بغیر ادب تخلیق کرنے لگی لیکن اس نے بغاوت کی ہمت نہیں کی۔ ایسے افسانہ نگاروں میں رام لال، جوگندر پال، اقبال متین، اقبال مجید، رتن سنگھ، غیاث احمد گدی، جیلانی بانو، آمنہ ابوالحسن، کلام حیدری، شرون کمار، قاضی عبدالستار، ستیش تبرا، قیصر تمکین، عوض سعید وغیرہ شامل ہیں۔ ان میں سے بعض نے تجربے بھی کیے علامتی اور تمثیلی رنگ بھی ان کے یہاں مل جاتا ہے۔ لیکن بغاوت نہیں ملتی۔

1960ء کے بعد اردو افسانے میں نئی فکر اور نئے احساس کی ترجمانی ملتی ہے۔ ان افسانوں میں پریم چند اور ترقی پسند افسانہ نگاروں کی حقیقت

نگاری سے انحراف اور آدرشوں کے باطل ہونے کی مایوسی ملتی ہے۔ افسانے کا اسٹرکچر پوری طرح توڑ دیا گیا۔ کہانی سے انحراف، پلاٹ، کردار، آغاز، انجام اور وحدت ثلاثہ اور ربط ضروری نہیں سمجھا گیا۔ زماں و مکاں کا ماورائی تصور اور انسان کا مابعد الطبعیاتی تصور پیش کیا گیا۔ زبان کی شکست و ریخت اور شخصی علامات کا استعمال کیا جانے لگا۔ ہندی، ریاضیاتی اور علمی اشکال کے استعمال کی کوشش کی گئی۔ انور سجاد، بلراج مین را، سریندر پرکاش اور احمد ہمیش نے افسانے کے اسٹرکچر کو بالکل بدل کر رکھ دیا۔ نئے تجربات کیے، نیا پیرایۂ اظہار وضع کیا۔ لسانی سطح پر بھی شکست و ریخت کے عمل کو روا رکھا۔ اور ایک نیا اسٹرکچر فراہم کیا۔ یہ افسانہ ترقی پسند افسانے سے مختلف تھا۔ وہ انسان کی خارجی زندگی کا سیدھا سادہ بیان نہ ہو کر انسان کے ظاہر و باطن کا امتزاج پیش کرتا ہے۔ یہ افسانہ کوئی سماجی حل پیش نہیں کرتا صرف سماجی صورت حال کو سامنے لاتا ہے۔ افسانہ نگار کسی خاص نظریے یا مقصد کے حصول کے تحت افسانہ نہیں لکھتے۔ معمول سے الگ کوئی انوکھی یا سنسنی خیز بات کہہ کر یا کوئی غیر متوقع انجام پیدا کر کے قاری کو حیران کرتا ہے۔ افسانے میں غیر ضروری تفصیلات سے گریز کیا گیا۔ نثری لوازم کی بجائے شعری لوازم کی طرف مراجعت کی گئی اور شاعری و نثر کی حدیں توڑنے کی کوشش کی گئی۔ حقیقت کو نظر انداز کر کے اس کو ماورائے حقیقت بنانے کی کوشش کی گئی۔ اس کے لیے ایسا اسلوب منتخب کیا گیا جو داستانوی، خواب نویسی جیسا ہو۔ اس کے لیے بیان کے منطقی تسلسل کو توڑ کر پیش کیا جانے لگا۔ شہروں کے نام نہیں لکھے گئے تا کہ افسانے میں مقامی رنگ نہ آنے پائے۔ کرداروں کی جگہ اُ ب، ج یا پھر اس کے صفات معمر آدمی، سرخ بالوں والا، نجات دہندہ استعمال کیے جانے لگے شمس الحق لکھتے ہیں :

> ''اردو افسانے کی نئی ہیئت، تصادم، تخریب اور تخلیقی آویزش کے ایسے ہی پیچیدہ لیکن زندہ و متحرک استعارے کی تخلیق کرتی ہے، اس نئی ہیئت کی تشکیل وہ چند استثنائی فن کار ہیں جنھوں نے خود کو انشائیت اور لفاظی پر مشتمل اردو کے عمومی اور مقبول افسانے کے اثر سے محفوظ رکھا اور غیر ادبی فنی تاویلات و تشریحات کو نظر انداز کر کے اپنے اسلوب کو اپنی انفرادیت کے ساتھ تخلیق کیا ہے۔
>
> (نیا اردو افسانہ۔ تفہیم اور تجزیہ : اردو افسانہ روایت اور مسائل : ص ۶۱۵)

ایسے فن کاروں میں انور سجاد، احمد ہمیش، بلراج مین را، سریندر پرکاش شامل ہیں۔ ان کے علاوہ کمار پاشی، بلراج کومل، راج ابے، دیویندر اسّر، خالدہ اصغر وغیرہ نے جدید افسانے کو آگے بڑھایا۔ جدید افسانے کی خصوصیات یا رجحانات کی تقسیم اس طرح ہو سکتی ہے۔ داستانوی، علامتی اور ابہامی یا تجریدی۔

اپنی معلومات کی جانچ

1. جدید افسانے میں کس سے انحراف کیا گیا؟

(ا) کہانی پلاٹ اور کردار سے (ب) منظر نگاری سے (ج) مکالمے سے (د) علامتوں سے

2. جدید افسانہ

(ا) مقصدیت کے حصول کو پیش کرتا ہے (ب) سماجی حل پیش نہیں کرتا

(ج) سنسنی خیزی پر زور دیتا ہے (د) چونکا دینے والے کلائمکس کو پسند کرتا ہے

3. جدید افسانے کا اسلوب

(ا) منطقی اور وضاحتی (ب) داستانوی و خواب نویسی (ج) مسجع و مقفیٰ (د) صحافتی

30.4.1 داستانوی فضا

حقیقت نگاری اور مقصدیت نے افسانے کو اکہرا کر دیا تھا۔ کسان مزدور اور طوائف کے بارے میں ہم ادب کے ذریعے معلومات حاصل

کررہے تھے۔جن ادیبوں نے ان کے مسائل پیش کیے وہ ان کا تجربہ بھی نہیں تھا۔اس طرح حقیقت نگاری بالواسطہ بیانیہ میں بدل کر صحافیانہ رنگ اختیار کرنے لگی تھی۔اس کی معنویت ایک سطحی ہوگئی تھی۔ نئے افسانہ نگار نے افسانے میں تہہ داری پیدا کرنے کے لیے نئے اسلوب کی بازیافت کی۔ اس نے ماضی کے موثر اسلوب کو آزمایا۔افسانے میں حکایتی اسلوب کو بروئے کار لاکر فن کار اس صنف کی مختصر ہیئت میں جدید زندگی کے مسائل کی گہرائیوں اور وسعتوں کو اس طرح سمو دیتا ہے کہ افسانے کے خاتمے پر قاری کو اپنے کسی مسئلے کا عکس نظر آنے لگتا ہے۔سلیم شہزاد لکھتے ہیں '' افسانے میں دیو مالائی کہانیوں کی کارفرمائی کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔صرف داستانی فضا تخلیق کرنے سے الگ بھی جدید افسانے میں اسطور بیانی کا رجحان پسندیدہ رجحان ہے۔یہ کبھی حقیقت نگاری کی طرح اسطور بیانی برائے اسطور بیانی ہوتی ہے۔کبھی ایک مکمل اسطوری واقعہ کسی عصری حقیقت کے بیان کا ذریعہ بن جاتا ہے اور کبھی اسطور کے علامتی معنوں کے ذریعے لمحۂ موجود میں وقوع پذیر ہونے والے کسی سانحے کو حال اور ماضی کے ایک دوسرے پر انطباق سے ہمعصر صورت واقعہ کے بیان اور اظہار کا روپ دیا جاتا ہے'' (قصہ جدید افسانے کا : ص ۷۷۔۷۸) یعنی ماضی میں گزری ہوئی صورتِ حال سے مماثل دور حاضر کی صورت حال کو حکایتوں اور داستانوں کے ذریعہ پیش کیا جاتا ہے۔ نئے افسانہ نگار نے داستانوی واقعات کو جدید زندگی کی تہہ داریوں اور ان میں گھرے ہوئے فرد کے مسائل کے لیے برتا۔جاتک تمثیلیں بھی ہر عہد میں بامعنی رہی ہیں۔انتظار حسین نے اس تکنک کو مہارت سے برتا۔

داستانوں میں درخت اور پرندے کی بڑی اہمیت ہوتی تھی۔ نئے افسانہ نگار نے مختلف سیاق وسباق میں اسے برتا۔یہ فرد کا استعارہ اور تہذیب کی علامت بن جاتا ہے۔پرندہ اپنی خوش رنگینیوں اور خوش الحانیوں کے سبب فطرت کی خوش رنگینیوں اور خوش الحانیوں کا استعارہ ہے۔فرد کے جذبات وخواہشات کی تمثیل ہے جسے داستانوں میں بڑی اہمیت دی گئی۔خاص طور پر طوطا ۔۔۔۔۔! پنچ تنتر کا استعمال کرکے افسانہ نگاروں نے جانوروں اور پرندوں کی زبانی انسانی حقائق کی رمز کشائی کی ہے۔شہروں کے نام کی جگہ بستی، طلسم آباد کا استعمال، تمثیل کے استعمال میں ممد ومعاون ثابت ہوتے ہیں۔ان بستیوں کے ذریعہ خوف، جبر، تسلط، غلامی، پسماندگی اور بے چارگی کو پیش کیا گیا۔اس ایک مثال سے افسانے کی داستانوی فضا کا تصور کیا جاسکتا ہے :

> '' کیا دیکھتا ہے کہ ایک لق ودق صحرا ہے، چار سو ریت کا ٹھاٹھیں مارتا سمندر اور پھونکتا سورج۔ وہ آنکھیں جھپکاتا ہے۔اب کیا دیکھتا ہے کہ بھرا بازار ہے، کھوے سے کھوا چھل رہا ہے۔ خریداروں کا ہجوم، دکانیں رنگا رنگ اشیا سے لدی پڑی ہیں۔کیا دیکھتا ہے کہ باغ باغیچے ہیں۔ پھل دار پودے ہیں۔رنگا رنگ پھول ہیں۔بھوک سی محسوس ہوتی ہے۔آگے بڑھ کر پھل توڑتا ہے۔منہ میں ڈالنے لگتا ہے تو پھل پتھر کا نکلتا ہے۔بازار میں آتا ہے تو دکانیں چیزوں سے بھری نظر آتی ہیں۔ہاتھ لگاتا ہے تو مٹی ہو جاتی ہیں۔ (بے دروازہ سراب : رشید امجد)

یہاں داستانوی انداز میں افسانہ نگار کردار وعمل کا فقدان، ہجوم میں رہ کر فرد کی تنہائی، مصنوعات کی فراوانی لیکن سب میں اصلیت اور فطری پن کی عدم موجودگی کا اظہار کرتا ہے۔زبان اور اسلوب داستانوی ہیں۔اس داستانوی فضا کی تخلیق میں افسانہ نگار تخیل اور فنطاسیہ دونوں کا استعمال کرتا ہے۔قدیم کے ذریعہ جدید کے نئے معنی تلاش کرتا ہے۔جدید افسانے میں داستانوی روایات کی بازیافت کبھی براہِ راست داستانوی اسلوب میں 'کبھی الہامی کتابوں کی زبان میں' کبھی ذاتی اسطور سازی سے کرتا ہے۔افسانے میں بیانیہ آپ بیتی اور جگ بیتی کا امتزاج ہوتا ہے۔جدید افسانے میں کسی ایک واقعے کے فن کارانہ بیان کی بجائے واقعے کی تہہ دار کیفیت اسے داستاں سے قریب کردیتی ہے۔کثرت خیال میں وحدت خیال کا تاثر پیدا کیا جاتا ہے۔خالدہ اصغر، رشید امجد، قمر احسن، شرون کمار ورما، انور قمر، سلام بن رزاق، حسین الحق، بیگ احساس، مظہر الزماں خاں، حمید سہروردی نے اس انداز کو کامیابی سے برتا ہے۔

اپنی معلومات کی جانچ

1. داستانوی افسانے میں کیسا اسلوب برتا جاتا ہے؟

(ا) حکایتی (ب) روایتی (ج) شاعرانہ (د) حقیقت نگاری

2. جدید زندگی کی تہہ داریوں اور مسائل میں گھرے فرد کی صورت حال کو کیسے پیش کیا جاتا ہے؟

(ا) لطیفوں کے ذریعہ (ب) حکایتوں اور داستانوں کے ذریعہ

(ج) شاعرانہ انداز سے (د) راست بیانیہ کے ذریعہ

3. داستانوی فضا کی تخلیق میں افسانہ نگار کس سے کام لیتا ہے؟

(ا) تخیل اور فنطاسیہ (ب) مافوق الفطرت عناصر سے

(ج) قصہ در قصہ سے (د) اشترا کی حقیقت نگاری سے

30.4.2 علامتی اظہار

''تشبیہ اور استعارے کی طرح علامت بھی فنی اظہار کا ایک اضافی وسیلہ ہے۔ ذہنی مفہوم کو ایجاز و اختصار کے پیرائے میں بیان کرنے کے لیے علامت کا استعمال کیا جاتا ہے۔ وزیر آغا کہتے ہیں'' اشاراتی عنصر تمام اصناف ادب میں اہمیت حاصل کر رہا ہے اور افسانے نے بھی اسے اپنے دامن میں جگہ دی ہے۔ دراصل تہذیبی ارتقا کے ساتھ ساتھ فرد کی تیز نگاہی بھی پروان چڑھ رہی ہے۔ اب وہ پلک جھپکتے میں بات کی گہرائی تک پہنچ جاتا ہے اور اس لیے واشگاف انداز کا کچھ زیادہ دلدادہ نہیں رہا'' علامتی افسانے کے بارے میں پروفیسر گوپی چند نارنگ کہتے ہیں'' علامتیں ایک طرح کے وسیع استعارے ہیں جن کے شعوری اور نیم شعوری رشتوں کو ابھار کر افسانہ نگار معنوی تہہ داری پیدا کر دیتا ہے۔ علامتوں کے حسی پیکر ہوتے ہیں لیکن بعض علامتوں سے افسانہ نگار فضا آفرینی کا یا محض خاص طرح کے تاثر ابھارنے کا کام لیتا ہے۔ ایسے افسانے کا کمال یہ ہے کہ وہ لغوی اور علامتی دونوں سطحوں پر پڑھا جاسکتا ہے''۔

(اردو افسانہ روایت و مسائل ص ۵۰۱)

علامت لفظ ہے جو اپنے سیاق و سباق سے نمودہ معنوی ابعاد اور وسعت و اختصار کے سبب بالترتیب کبھی افسانے کے لیے اور کبھی شعر کے لیے موزوں ہوتی ہے۔ افسانہ چوں کہ وسیع لسانی تناظر رکھتا ہے اور اضافی وسائل کے بغیر نثر بے جا انتشار و بے ربطی کا شکار ہوسکتی ہے۔ اس لیے افسانہ نگار کم سے کم لفظوں میں اظہار خیال کرنے کے لیے اشارتی زبان کا سہارا لیتا ہے۔ علامت کثیر المفہوم ہوتی ہے۔ علامت کا انتخاب شعوری نہیں ہوتا۔ بلکہ افسانے کے موضوع کے اعتبار سے علامت اخذ ہو جاتی ہے۔ علامت بیک وقت پیکر، تمثیل اور استعارہ بھی ہوسکتی ہے۔ علامت کا مقصد یہ ہونا چاہیے کہ علامت کے سامنے آتے ہیں معنی کی ترسیل ہو جائے۔ افسانے میں بیان واقعہ سے ایک خاص افسانوی تاثر پیدا کرنا افسانہ نگار کا مقصد ہوتا ہے۔ صورت واقعہ کی مناسبت سے کوئی علامت تاریخ النسانی کے کسی عہدہ سے متعلق یا عصری مشینی زندگی کے کرب اور غیر حسی آلات و لوازم سے ماخوذ ہوتی ہے۔ افسانے پر علامتیں لادی نہیں جاسکتیں۔ لفظی اور معنوی دونوں زاویوں سے علامت ایک فنی مظہر ہونے کے ناطے افسانے میں اخذ و انتخاب کے متعلق سے ایک خود کار ذریعۂ ترسیل ہوتی ہے۔ بلراج مین را کے افسانے'' ماچس'' کے بنیادی کردار کی آنکھ بے وقت کھل جاتی ہے' وہ سگریٹ

سلگانا چاہتا ہے لیکن ماچس خالی ہے وہ پورے کمرے کو چھان مارتا ہے لیکن ماچس کی سب ڈبیاں خالی ہیں۔ سرد رات میں وہ باہر نکلتا ہے کئی جگہوں پر ماچس کی تلاش کرتا ہے لیکن ناکام رہتا ہے۔ پھر وہ ایک مرمت شدہ پُل پر پہنچتا ہے یہاں سرخ کپڑے سے لپٹی لالٹین سے وہ سگریٹ سلگانا چاہتا ہے کہ ایک سپاہی سے پکڑ کر تھانے لے جاتا ہے وہاں کئی لوگ میز کے گرد بیٹھے سگریٹ پی رہے ہیں اور کئی ماچسیں رکھی ہیں لیکن اس پر آوارہ گردی کا الزام لگا کر اس کو وہاں سے فوراً نکل جانے کا حکم دیا جاتا ہے۔ واپسی پر اس کو ایک آدمی ملتا ہے جس سے وہ ماچس مانگتا ہے لیکن وہ شخص خود ماچس ہی کی تلاش میں گھر سے نکلا ہے دونوں ایک دوسرے کے چھوڑے ہوئے راستے پر آگے بڑھ جاتے ہیں۔

یہاں ماچس علامت ہے تلاش کی، زندگی کی معنویت کی یا تڑپ کی، کسی مقصد یا آئیڈیل کو پانے کی جس کے لیے پورا وجود سلگ رہا ہے۔ ان میں ایسے کردار بھی آتے ہیں جو اسے ماچس نہیں دے پاتے۔ اور وہ سگریٹ سلگانے میں کامیاب نہیں ہوسکتا۔ وہ زندگی کے اندھیرے میں جگہ جگہ بھٹکتا ہے لیکن اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہوتا۔

انسان زندگی کی معنونیت کی تلاش میں سرگرم ہے وہ مسلسل چل رہا ہے، جستجو و تجسس کی اس سڑک پر جو کبھی ختم نہیں ہوتی۔

گوپی چند نارنگ لکھتے ہیں :

> ''علامتی تیز روشنی (Flash) کی طرح سامنے آتی ہیں اور ایک ساتھ ان گنت معنوی امکانات جھلمل جھلمل کرنے لگتے ہیں ہم اپنے تجربے اور احساس کی بنا پر ایک دو معنی کو فوری طور پر لیتے ہیں اور باقی کو تحت الشعور کی دھند میں روشنی اور تاریکی کے بلبلوں کی طرح ابھرنے اور مٹنے کے لیے چھوڑ دیتے ہیں۔ ایسے افسانوں میں علامتیں ایک دوسرے کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے ہوئے استعاروں کا مرتبہ رکھتی ہیں اور ایک نظام کی حیثیت سے کافرما ہوتی ہیں۔ اگر غور و فکر سے کام لیا جائے تو اس نظام تک رسائی حاصل کرنا اور اس کی کڑیاں ملانا چنداں مشکل نہیں ہے۔'' (اردو افسانہ روایت و مسائل ۵۰۲۔ ۵۰۳)

سلیم شہزاد لکھتے ہیں :

> ''ہر جدید افسانہ علامتی افسانہ نہیں ہوتا۔
>
> افسانے کی علامت شعر کی علامت سے جدا ہوتی ہے۔
>
> علامت لفظ، فقرہ یا جملہ ہے۔
>
> علامتی افسانے کی زبان نجی اشارتی زبان ہوتی ہے۔
>
> علامت ہیئتی اور معنوی دو سطحیں رکھتی ہیں۔
>
> افسانے سے باہر علامت کے معنی کچھ اور افسانے میں کچھ اور ہوتے ہیں۔
>
> یہ علامت کی وہ عملی خصوصیت ہے۔
>
> بیرون سے ماخوذ علامات کو ان کے روایتی مفاہیم سے جدا معنی دیے جاسکتے ہیں
>
> اور علامت کی کثیر المفہومی ابہام پیدا کرتی ہے۔''

اپنی معلومات کی جانچ

1. علامت

(ا) ایک وسیع استعارہ ہے (ب) تشبیہ کی بدلی ہوئی شکل ہے

(ج) تمثیل کی توسیع ہے (د) پیکر کا دوسرا نام ہے

2. علامتوں سے افسانہ نگار کیا کام لیتا ہے؟

(ا) فضا آفرینی اور تاثر ابھارنے کا (ب) جزوئیات نگاری اور تفصیلات کا

(ج) کردار نگاری کا (د) مکالموں کی تشریح کا

3. افسانے کی علامت

(ا) شعر کی علامت ہوتی ہے (ب) شعر کی علامت سے جدا ہوتی ہے

(ج) گنجلک ہوتی ہے (د) واضح ہوتی ہے

30.4.3 تجرید وابہام

جدید افسانہ روایتی تصور سے انحراف کرتا ہے' بے ماجرا' بے کردار' بے واقعہ افسانہ ابہام پیدا کرتا ہے۔ کردار یا واقعے کی تجرید سے افسانے میں ابہام پیدا ہوتا ہے۔ کردار کی تجرید یہ ہے کہ انسانی یا حیوانی صفات سے جدا صفات رکھنے والے بے شناخت کردار افسانے میں لائے جائیں۔ ناموں کی جگہ الف۔ یے' جیم یا سرخ بالوں والا انسان' بے سر کا آدمی لکھا جائے۔ واقعے کی تجرید یہ ہے کہ فطری یا غیر فطری طور پر واقع ہونے والا عمل غیر منطقی' لاشعوری اور زماں و مکاں سے عاری ڈھنگ سے وقوع پذیر ہو۔ کردار کی تجرید سے کردار کے خاکے یا ہیولے حاصل ہوتے ہیں۔ افسانے میں جن کی موجودگی سے ابہام رونما ہوتا ہے۔ کردار کی تجرید سے بالواسطہ طور پر افسانے کے ماحول منظر اور پس منظر کی بھی تجرید ہوتی ہے۔ افسانے میں بے ہیئتی سے ایک ہیئت تشکیل پاتی ہے۔ افسانوی واقعے کی منطقیت یعنی آغاز' وسط اور انجام کے تصورات بے معنی ہو جاتے ہیں اور بے ماجرا' بے کردار یا بے واقعہ افسانے سے یہی مراد ہے کہ افسانے میں منطقی تسلسل مفقود' کرداروں کی جگہ ان کے ہیولے اور واقعات کے بجائے ذہنی وقوعی تصورات پائے جاتے ہوں۔ تجریدی افسانے کا بیانیہ جو افسانوی اظہار کے وسیلے زبان سے متعلق ہے غیر مربوط' روایتی' لسانی قواعد سے روگرداں اور بہ ظاہر بے معنویت کا غماز ہوتا ہے اس سے بھی ابہام پیدا ہوتا ہے۔ تجریدی افسانے کے نام سے نقطوں' آڑی ترچھی لکیروں اور قوسوں کے استعمال سے ابہام اور اشکال پیدا کرنے کی ایسی کوششیں بھی ملتی ہیں جن کی وجہ سے افسانے میں ہندسی اور ریاضیاتی وغیرہ خاکوں اور علمی اصطلاحوں کا چلن ہوتا ہے۔

تجریدی افسانے کی اہم خصوصیات حسب ذیل ہیں:

کردار کی تجرید سے افسانے میں ابہام رونما ہوتا ہے۔

کردار کی تجرید ماحول اور منظر و پس منظر کی بھی تجرید ہے۔

واقعے کی تجرید کردار کے تعملات کو متاثر کرتی ہے۔

کردار اور واقعے کی تجرید سے افسانے کی خارجی اور داخلی ہیئتیں متاثر ہوتی ہیں۔

شعری اظہار اور شعری ہیئت افسانے کو مبہم بناتے ہیں۔

چند مثالیں پیش ہیں:

اور پھر دن رات کے ساتھ کئی چکر کاٹنے کے بعد مان لیجیے کہ وہ اب ایک دائرہ ہے

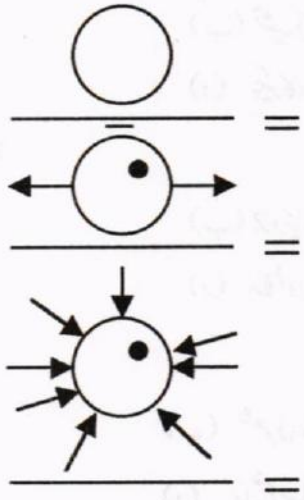

بریکٹوں کے درمیان ایک دائرہ: شوکت حیات

افسانہ نگار نے اپنی تخلیق کا عنوان اس طرح لکھا ہے

( ) { } [ ] کے درمیان ایک ○

شام	کا	دیپک	جلا	من	کا
دیا	بجھنے	لگا	یا	ربوس	شام
کا	دیپک	ج	من	کا	دیا

ہوزا۔میم۔فیہ=قمر احسن

افسانے کی خارجی ہیت کو بدلنے کی مثال

دوستی اس مثلث سے پہلے یوں تھی

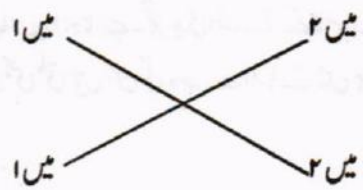

اب یوں ہوگئی ہے

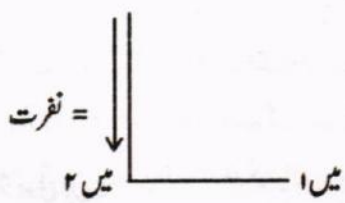

(رخش پا: اکرام باگ)

افسانے میں ان خاکوں سے پہلے ایک مثلث (△) دیا گیا ہے جس کے ماضی کی تفصیل یہاں درج ہے۔

تم بالکل صفر ہو' یہ نقشہ دیکھو:

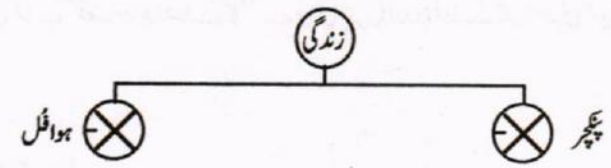

- (درست) لیکن + (فیوز)

ایسی حالت میں .....؟

عمل = 0 (تم منشور ہو۔ تمہارا اپنا رنگ کون سا ہے)

..... سرخ .....

(0 = + x -) (بجلی کی رو نہیں دوڑتی: انور امام)

زندگی کی طبعی میزان پر عمل اور حالت کو وزن کرنے کا مظاہرہ یا تجرید ہے

(انہیں زندگی کی گاڑی کے دو پہیے بھی کہا جا سکتا ہے) افسانے کے عنوان میں ریاضی کی علامتوں کے استعمال کو لسانی اظہار سے مماثل کیا گیا۔

اس نے لکھا

علم	زوال	حسن
		دنیا
گمراہی		

غیر مرئی وجود نے لکھا

علم	زوال	حسن
		دنیا
گمراہی		فکر

(برف باری: انور خاں)

''غیر مرئی وجود'' فرد کے کردار کی تجرید ہے جس کے ''لکھنے'' کے عمل سے ماورائے حقیقی معنویت اخذ ہوتی ہے۔ یہ دراصل فرد اور اس کے ضمیر کی کشمکش کا مظاہرہ ہے جو خانوں میں لفظوں کے کھیل کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے اور جس سے افسانے میں بے ہیئتی کی ایک ہیئت تشکیل پاتی ہے۔ افسانے میں اس قسم کی مظاہراتی کوششوں میں کہیں کہیں ایک قسم کا بیان ضرور ملتا ہے لیکن جسے افسانوی بیان یا بیانیہ کہتے ہیں وہ کہیں پایا نہیں جاتا۔ واضح رہے بیانیہ مربوط یا غیر مربوط ہونے سے قطع نظر افسانے کی اولین شرط ہے اس کے بغیر افسانہ واقع نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ کہا جا سکتا ہے کہ ابہام و تجرید کے نام پر افسانے میں نقطے' لکیریں' قوسیں اور خاکے وغیرہ شامل کر دینے سے افسانہ نگار اپنی تخلیق کی بنیادی خصوصیت گنوا دیتا ہے جو

تجریدی افسانے بیانیہ کے سہارے لکھے گئے ہیں ان میں شکستہ لسانی اظہار، منتشر خیالی کا اسلوب، ہذیائی کیفیت اور قبیح خوابی کے اثرات نمایاں ملتے ہیں۔ افسانے میں نثری نظم کا استعمال ابہام پیدا کرنے کے لیے کیا جاتا ہے۔

(یہ ساری مثالیں سلیم شہزاد کی کتاب ''قصہ جدید افسانے کا'' سے لی گئی ہیں) اردو افسانے میں عصری حسیت پر بھی زور دیا گیا۔

اپنی معلومات کی جانچ

1. افسانے میں ابہام کیسے پیدا ہوتا ہے؟

(ا) مربوط پلاٹ سے (ب) واقعاتی تسلسل سے

(ج) کردار کی تجرید سے (د) واضح مکالموں سے

2. بے معنویت کب محسوس ہوتی ہے؟

(ا) غیر مربوط روایتی، لسانی قواعد سے روگردانی سے (ب) رنگین بیانی سے

(ج) شاعرانہ نثر سے (د) انشائیہ کی زبان سے

3. تجریدی افسانے میں کیا تجربہ کیا گیا؟

(ا) جغرافیائی ماحول کا (ب) سائنسی ادب کا (ج) ریاضیاتی شکلوں کا (د) مصوری کا

30.5 تنقید

جدیدیت کے رجحان کی حوصلہ افزائی کرنے میں آل احمد سرور کا نام سرفہرست ہے۔ انہوں نے خود کو کسی خاص نظریے کا اسیر نہیں ہونے دیا۔ وہ تنقید کے مختلف نظریوں سے استفادہ کرتے رہے۔ انہوں نے جدید رجحان کا کھلے دل سے استقبال کیا۔ آل احمد سرور نے ''جدیدیت اور ادب'' پر ایک سمینار کیا۔ اس سمینار میں انہوں نے مقالہ پڑھا اور جدیدیت کے مفہوم کی وضاحت کرتے ہوئے نے کہا کہ گذشتہ دور میں نظریے کو فیشن اور فارمولے کے طور پر برتا گیا اور ادب کو نظریے کی غلامی میں دے دیا گیا تھا۔ اس کا ردعمل ہر طرف ہو رہا ہے۔ جدید انسان جکڑ بندی سے نکل کر زندگی کے حقائق کو اپنی نظر اور اپنے تجربے کے واسطے سے دریافت کرنا چاہتا ہے۔۔۔۔ ادب اور شاعری مجرد خیالات اور بندھے ٹکے اصولوں کی تبلیغ کا نام نہیں ہے۔ ادب اور شاعری محسوس حقائق کی معنی خیز مصوری ہے۔ نظر اور نظریے، مسرت سے بصیرت تک، فکر روشن اور دانش و اقبال، آل احمد سرور کی تنقیدی مضامین کے اہم مجموعے ہیں۔

اردو میں ہیئتی تنقید کی بنیاد مسعود حسین خاں نے رکھی۔ انہوں نے تنقید کو ایک نیا زاویۂ نظر دیا۔ انہوں نے اردو میں ہیئتی تنقید کی بنیاد استوار کی۔ مسعود حسین خاں نے پہلی بار لسانی نقطۂ نظر سے اسلوب شناسی کے اصول اور چند عملی نمونے پیش کیے۔ مسعود حسین خاں کہتے ہیں ''لسانی مطالعہ شعر دراصل شعریات کا جدید ہیئتی نقطہ نظر ہے لیکن یہ اس سے کہیں زیادہ جامع ہے اس لیے یہ شعری حقیقت کا کلی تصور پیش کرتا ہے۔ ہیت اور موضوع کی قدیم بحث اس نقطہ نظر سے بے معنی ہو جاتی ہے۔ یہ کلاسیکی نقد و ادب کے اصولوں کی تجدید کرتا ہے اور قدما کے مشاہدات اور اصطلاحات ادب کو سائنسی بنیاد عطا کرتا ہے۔ لسانیاتی مطالعۂ شعر صوتیات کی سطح سے ابھرتا ہے اور ارتقائی صوتیات، تشکیلیات، صرف نحو اور معنیات کی پر پیچ وادیوں سے گزرتا ہوا اسلوبیات پر ختم ہوتا ہے۔

شمس الرحمٰن فاروقی بھی ہیئتی تنقید کو فروغ دینے والے نقاد سمجھے جاتے ہیں۔ وہ اس خیال کے حامی ہیں کہ ''شعر کے اصلی معنی تک پہنچنے کے

لیے شاعر کے حالات اس کے محرکات' اس کا ماحول' اس کا معاشرہ اور نفسیاتی کیفیات وغیرہ بے معنی اور غیر ضروری ہیں''شعر کی تعریف' تنقید و تنقیص صرف فن شعر کے حوالے سے ہوسکتی ہے۔فن کی قدر و قیمت کا تعین وہ فن میں مضمر تجربے کو بتاتے ہیں۔اس نظریے کی بنیاد پر انہوں نے عملی تنقید کی۔ فاروقی نے ہیئت کے مطالعے کو اولیت دی لیکن معاشرتی اور تہذیبی عوامل کو نظر انداز نہیں کیا۔شمس الرحمٰن فاروقی نے تجربے' ہیئت اسلوب' علامت' پیکر' استعارہ' شعریت' ترسیل' ابلاغ معنی' ابہام جیسے بنیادی تصورات کی توضیح کا اہم کام انجام دیا اور ہیئتی تنقید کی بنیادوں کو استوار کیا۔انہوں نے مشرقی شعریات کا گہرائی سے مطالعہ کیا۔اس کا عملی نمونہ ان کی کتاب ''شعر شعور انگیز'' میں ملتا۔اس کے علاوہ شعر' غیر شعر اور نثر' لفظ و معنی' عروض' آہنگ اور بیان' افسانے کی حمایت میں' تنقیدی افکار ان کے تنقیدی مضامین کے مجموعے ہیں۔

گوپی چند نارنگ اسلوباتی طریق کار سے فن کی معنیاتی سطحوں کا مطالعہ کرتے ہیں۔ان کی اسلوبیاتی تنقید کے بہترین نمونے ''اسلوبیات میر'' اور ''اقبال کا فن'' ہیں۔انہوں نے میر کے اسلوب کا صوتیاتی' صرفی اور نحوی مطالعہ کر کے میر کی شاعری کی منفرد خصوصیات کا احاطہ کیا ہے۔اقبال کی شاعری کے صوتیاتی نظام کا بھی انہوں نے گہرائی سے مطالعہ کیا ہے۔گوپی چند نارنگ نے نثر پر خصوصی توجہ کی ہے۔افسانے پر انہوں نے قابلِ قدر کام کیا ہے۔انتظار حسین کی افسانہ نگاری' جدید افسانے کے اہم فن کار مین را اور سریندر پرکاش کے علاوہ سلام بن رزاق کے افسانے ''انجام کار'' کے تجزیے کے اہم کارنامے ہیں۔انہوں نے اپنے مضامین کے ذریعہ جدید افسانہ نگاروں کو گمراہی سے بچایا۔''خواجہ حسن نظامی کی نثری ارضیت'' ذاکر صاحب کی نثر' میں انہوں نے ان مصنفین کے اسالیب کا لسانیاتی مطالعہ کیا ہے۔بیدی کی افسانہ نگاری میں استعاراتی جڑیں بھی تلاش کی ہیں۔گوپی چند نارنگ نے لسانی تنقید کے بدلتے ہوئے رجحانات کا بھی گہرائی سے مطالعہ کیا ہے۔انہوں نے ساختیات' پس ساختیات اور مابعد جدیدیت کے تصورات کے نظریات سے اردو والوں کو روشناس کروایا بلکہ عملی تنقید کے نمونے بھی پیش کیے۔ان نظریات کا مشرقی شعریات سے تقابل کرتے ہوئے ان کی جڑیں مشرق میں دریافت کیں۔ان کی اہم تصانیف' ادبی تنقید اور اسلوبیات' ساختیات' پس ساختیات اور مشرقی شعریات' اسلوبیات میر' اقبال کا فن سانحۂ کربلا بطور ایک شعری استعارہ وغیرہ ہیں۔

مغنی تبسم کا شمار بھی ہیئتی نقادوں میں ہوتا ہے۔وہ تنقید میں لسانی تجزیے سے کام لیتے ہیں اور اسلوبیاتی طریق کار کو برتتے ہیں جہاں ضرورت ہو نفسیاتی اور سماجی عوامل سے بھی کام لیتے ہیں۔وہ شعر کے موضوع اور مفہوم پر زور دیتے ہیں اور شاعر کے عصری حالات و واقعات کی باز آفرینی اس کے شعری ذہن کے حوالے سے کرتے ہیں وہ شعر میں خارجی عوامل کے بالواسطہ اظہار کے قائل ہیں۔ان کی توجہ شعر کی ہیئت پر مرکوز ہوتی ہے۔وہ ہیئت کے مختلف عناصر کا تجزیہ کر کے شاعر کے شعور کا ادراک کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ان کی اہم تصانیف' بازیافت' آواز اور آدمی اور لفظوں سے آگے ہیں۔

ہیئتی نقادوں میں ایک اہم نام حامدی کاشمیری کا بھی ہے۔وہ مواد اور ہیئت کی دوئی کے قائل نہیں ہیں۔وہ شاعر اور ادیب کی داخلی واردات اور تجربے کے تلاش و تعین پر زور دیتے ہیں اور اسے اکتشافی تنقید کا نام دیتے ہیں۔اکتشافی تنقید کی تعریف و وضاحت اس طرح کرتے ہیں ''اس نظریۂ تنقید کی مدد سے نقاد صحیح معنوں میں تخلیق کے بطن میں اترتا ہے اور قاری کو بھی اپنے تجربے میں شریک کرتا ہے'' اس طریقۂ کار کو انہوں نے عملی تنقید میں برتنے کی کوشش کی ہے' نئی حسیت اور عصری اردو شاعری''۔''ناصر کاظمی کی شاعری''۔''کارگہہ شیشہ گری''۔''تفہیم و تنقید'' اور ''معاصر تنقید'' ان کی اہم تصانیف ہیں۔

شمیم حنفی نے اپنے مقالے ''جدیدیت کی فلسفیانہ اساس'' اور ''نئی شعری روایات'' کے ذریعہ جدیدیت کی نظریاتی بنیاد کو مستحکم کیا۔انہوں نے ہیئتی طریق کار کی بجائے ادبی تخلیق کے سماجی و تاریخی محرکات کے مطالعہ کو فوقیت دی۔وہ خیال کو اہمیت دیتے ہیں لیکن اس بات کے قائل ہیں کہ جذبے اور احساس کے بغیر خیال فن کا حصہ نہیں بن سکتا۔شمیم حنفی کے خیال میں نئی حقیقت پسندی پورے انسان کے بسیط تجربے کو پیش کرتی ہے اور یہی جدیدیت کا اولین مقصد ہے''۔وہ لسانی صداقت کے بارے میں کہتے ہیں کہ ''لسانی صداقت کی ایک ساتھ کئی پرتیں ہوتی ہیں اور اس صداقت کا حوالہ جب ادب ٹھہرتا ہے تو پوری انسانی کائنات اپنی نیکی بدی اپنے سناٹے اور شور شرابے کے ساتھ آن موجود ہوتی ہے۔تخلیقی اظہار کا جزو بننے کے بعد لفظ'

لفظ نہیں رہ جاتا' تجربہ اور واردات اور وقوعہ بن جاتا ہے۔ شمیم حنفی کی تنقیدی تصانیف ''جدیدیت کی فلسفیانہ اساس' نئی شعری روایات' غزل کا نیا منظر نامہ اور قاری سے مکالمہ'' اہم ہیں۔

جدید تنقید میں وارث علوی کا نام بھی اہم ہے۔ وارث علوی نے تاثراتی تنقید کے طریق کار کو اپنایا۔ اچھے تاثراتی نقاد کی پہچان وارث علوی کے مطابق یہ ہے کہ وہ صاحب فکر اور صاحب ذوق ہو' اس کا مطالعہ نہایت وسیع ہو' ادب کو پرکھنے اور خیالات کو دل کش اور موثر اسلوب میں پیش کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو۔ وارث علوی اس کسوٹی پر پورے اترتے ہیں۔ وارث علوی نے اکثر تاثراتی تنقید سے انحراف بھی کیا ہے۔ وہ صرف تاثرات کو ہی کافی نہیں سمجھتے بلکہ تجزیے پر بھی زور دیتے ہیں۔ وارث علوی کا خاص میدان فکشن ہے۔ اردو افسانے اور ناول پر ان کی گہری نظر ہے۔ انہوں نے منٹو اور بیدی کے فن کا گہرائی سے مطالعہ کیا۔ ان کی چند اہم تصانیف ''تیسرے درجے کا مسافر' اے پیارے لوگو' حالی مقدمہ اور ہم' خندہ ہائے بے جا' منٹو ایک مطالعہ بورژوا ثری بورژوا ثری' ادب کا غیر اہم آدمی' لکھتے رقعے لکھے گئے دفتر وغیرہ ہیں۔

عالم خوندمیری نے وجودیت پسندانہ طرز فکر کو مطالعۂ ادب کی اساس بنا کر اردو تنقید کو ایک جہت عطا کی۔ وہ کلیدی الفاظ اور علائم کے ذریعہ کسی فن پارے کے بنیادی تجربے تک پہنچ جاتے ہیں۔ بقول مغنی تبسم جدید شاعروں اور افسانہ نگاروں کی تخلیقات کا جائزہ لیتے ہوئے انہوں نے تہذیب کے عصری بحران' موجودہ صدی کے انسانی شعور میں تشویش اور تردد کے عناصر اور شعر و ادب پر ان کے اثرات کا جس طرح تجزیہ کیا اس سے جدید حسیت کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے''۔ انہوں نے غالب' اقبال' مخدوم اور ن۔م راشد کے فکری میلانات کو ایک نئے زاویے سے دیکھا۔ عالم خوندمیری کے مضامین کے دو مجموعے ''اقبال اور عشق'' اور مضامین عالم خوندمیری'' کے نام سے شائع ہو چکے ہیں۔

جدید نقادوں میں ایک گروپ ایسا بھی ہے جو فن پارے کو موضوع بحث بناتا ہے۔ اسی کی بنیاد پر اس کی قدر و قیمت متعین کرتا ہے۔ فنی خصوصیات کے علاوہ وہ تاریخی' تہذیبی و سماجی عوامل پر زور دیتا ہے۔ ایسے تنقیدی رویے کو تمدنی تنقید کہا جاسکتا ہے۔ فیضل جعفری اور وحید اختر کے نام ایسے ہی نقادوں کے زمرے میں آتے ہیں۔

جدیدیت کے فروغ کے ساتھ تنقید کے نئے زاویے سامنے آئے۔ ان میں سب سے اہم نظریہ ہیئتی تنقید کا ہے۔ اس کے ساتھ لسانیاتی اہمیت کو تسلیم کیا گیا اور اسلوبیاتی تنقید کے کامیاب تجربے کیے گئے۔ اس سے آگے کی منزل ساختیات' پس ساختیات' رد تشکیل اور قاری اساس تنقید ثابت ہوئی۔ ادھر 1985ء سے مابعد جدیدیت نے ایک رجحان کی صورت اختیار کر لی۔ نئی تاریخیت اور تانیثی تنقید پر بھی لکھا جانے لگا ہے۔ سماجی اور تاریخی مطالعہ دوبارہ اہمیت اختیار کر رہا ہے۔

اپنی معلومات کی جانچ

1. آل احمد سرور نے جو سمینار کروایا اس کا کیا نام تھا؟

(ا) جدیدیت کی فلسفیانہ اساس (ب) جدیدیت ایک رجحان

(ج) جدیدیت مسائل و تجزیہ (د) جدیدیت اور ادب

2. ہیئتی تنقید کی بنیاد کس نے رکھی۔

(ا) احتشام حسین (ب) مسعود حسین خاں (ج) شمس الرحمٰن فاروقی (د) گوپی چند نارنگ

3. مغنی تبسم کا شمار کن نقادوں میں ہوتا ہے؟

(ا) ہیئتی نقادوں میں (ب) تاثراتی نقادوں میں (ج) اشتراکی نقادوں (د) نفسیاتی نقادوں میں

30.6 خلاصہ

جدید سائنس اور تکنالوجی نے بے پناہ ترقی کی ہے۔ صنعتی ترقی کی وجہ سے آدمی کی شناخت ختم ہوتی جارہی ہے۔ انسانوں کو ہر لمحہ مٹ جانے کا خوف ہے۔ کثرت آبادی کا مسئلہ ہے۔ سائنس اور تکنالوجی کے مقابلے میں روحانی اور اخلاقی قدریں سست رو ہیں۔ جدیدیت کی جڑیں فلسفۂ وجودیت سے ملتی ہیں۔ فلسفۂ وجودیت یہ ہے کہ سب کچھ ختم ہونے والا ہے۔ موت اصل حقیقت ہے انسان ابدیت کے ایک خیالی تصور میں جی رہا ہے۔

1960ء کے لگ بھگ جدید ذہن کے ادیبوں نے ترقی پسند مصنفین کی جماعت بندی اور نظریاتی وابستگی کے خلاف آواز بلند کی' انہوں نے کہا کہ ادیب کی وابستگی مخصوص سیاسی جماعت یا نظریے سے نہیں بلکہ اپنی ذات سے ہونی چاہئیے۔ جدیدیت کی مختلف تعریفیں کی گئیں لیکن اس کی آسان تعریف یہ ہے کہ جدیدیت ایک روئے' ایک اندازِ فکر کا نام ہے۔ اس کا مطلب ہر نقش کہن کو مٹانا نہیں ہے۔

1960ء کے بعد اردو افسانے میں پریم چند اور ترقی پسند افسانہ نگاروں کی حقیقت نگاری سے انحراف کیا گیا۔ کہانی سے انحراف' پلاٹ' کردار' آغاز' انجام اور وحدت تاثر کو ضروری نہیں سمجھا گیا۔ نئے نئے تجربے کیے گئے۔ شاعری اور نثر کی حدیں توڑنے کی کوشش کی گئی۔ جدید افسانے کو اس طرح تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ داستانوی' علامتی' ابہامی یا تجریدی داستانوی افسانے میں حکایتی اسلوب کو بروئے کار لاکر اسطور اور دیو مالائی کہانیوں کے ذریعہ کسی ہم عصر واقعے کو بیان کیا جاتا ہے۔ علامتی اظہار کے ذریعہ شعوری اور نیم شعوری رشتوں کو ابھار کر افسانہ نگار معنوی تہہ داری پیدا کرتا ہے۔

بے ماجرا' بے کردار' بے واقعہ افسانہ ابہام پیدا کرتا ہے۔ کردار یا واقعے کی تجرید سے افسانے میں ابہام پیدا ہوتا ہے۔ غیر مربوط' روایتی' لسانی قواعد سے روگردانی کرکے بے معنویت پیدا کی جاتی ہے۔ شعری اظہار اور ہیئت بھی افسانے کو مبہم بناتی ہے۔ تجریدی افسانوں میں یہی طریقے برتے گئے۔ ریاضیاتی شکلیں بنائی گئیں۔

جدیدیت میں تنقید نے بے حد ترقی کی۔ آل احمد سرور نے جدیدیت کا کھلے دل سے استقبال کیا۔ ہیئتی تنقید کی بنیاد پروفیسر مسعود حسین خاں نے رکھی۔ شمس الرحمٰن فاروقی نے بھی ہیئتی تنقید کو فروغ دیا۔ انہوں نے مشرقی شعریات کا بھی گہرائی سے مطالعہ کیا۔ گوپی چند نارنگ نے اسلوبیاتی تنقید کے بہترین نمونے پیش کیے۔ انہوں نے افسانے پر خاص توجہ دی۔ ساختیات' پس ساختیات اور مابعد جدیدیت کے تصورات کو اردو والوں سے روشناس کروایا۔ مغنی تبسم کا شمار بھی ہیئتی نقادوں میں ہوتا ہے۔ حامدی کاشمیری بھی ہیئتی نقاد ہیں لیکن وہ اس تنقید کو اکتشافی تنقید کا نام دیتے ہیں۔ شمیم حنفی نے سماجی و تاریخی محرکات کے مطالعے کو فوقیت دی۔ وارث علوی نے تاثراتی طریق کار کو اپنایا۔ وہ فکشن کے نقاد ہیں۔ منٹو اور بیدی پر انہوں نے خصوصی توجہ صرف کی۔ عالم خوندمیری نے وجودیت پسندانہ طرز فکر کو مطالعۂ ادب کی اساس بنا کر اردو تنقید کی۔ فیصل جعفری اور وحید اختر نے ''تمدنی تنقید'' کی۔

30.7 نمونہ امتحانی سوالات

مندرجہ ذیل ہر سوال کا جواب تقریباً تیس سطروں میں لکھیے۔

1. جدیدیت کا پس منظر تحریر کیجیے۔
2. افسانے میں تجرید و ابہام کے جو تجربے کیے گئے ان پر روشنی ڈالیے۔
3. جدید تنقید پر تفصیلی نوٹ لکھیے۔

مندرجہ ذیل ہر سوال کا جواب تقریباً پندرہ سطروں میں لکھیے۔

1. فلسفۂ وجودیت پر مختصر نوٹ لکھیے۔
2. افسانے میں داستانوی فضا کو کس طرح برتا گیا؟
3. ہیئتی تنقید کے اہم نقادوں کے اہم کارناموں کا مختصر جائزہ لیجیے۔

30.8 فرہنگ

وجودیت = احساس وجود کا فلسفہ

تنسیخ = منسوخ کرنا

مافوق الفطرت = فطرت سے پرے

کثیر المفہومی = کئی مفاہیم کا حاصل

غیر مرئی = جو دکھائی نہ دے

ہذیانی = بڑ، بیہودہ گوئی، شدت بخار کی حالت میں بے ربط گفتگو

قبیح = مشکل

30.9 سفارش کردہ کتابیں

1. جدیدیت اور ادب ..... آل احمد سرور
2. جدیدیت کی جمالیات ..... لطف الرحمٰن
3. اردو افسانہ روایت اور مسائل ..... گوپی چند نارنگ
4. اردو افسانے میں عصری حسیت ..... یاسمین فاطمہ
5. قصہ جدید افسانے کا ..... سلیم شہزاد

☆☆☆

مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی

نصاب

ایم اے اُردو (فاصلاتی تعلیم)

سال اول :

پہلا پرچہ غزل، قصیدہ اور رباعی

دوسرا پرچہ مثنوی، مرثیہ اور نظم

تیسرا پرچہ اردو زبان وادب کی تاریخ

چوتھا پرچہ فارسی اور ہندی

سال دوم :

پانچواں پرچہ ادبی تنقید

چھٹا پرچہ ترجمہ نگاری اور ابلاغیات

ساتواں پرچہ داستان، ناول، افسانہ اور ڈراما

آٹھواں پرچہ غیر افسانوی ادب (خاکہ نگاری/انشائیہ سوانح/خطوط نویسی/طنز و مزاح)

تیسرا پرچہ : اردو زبان وادب کی تاریخ

حصہ اول

اکائی 1 زبان کی تعریف اور ہند آریائی کا ارتقا

اکائی 2 اُردو زبان کا آغاز وارتقا، مختلف نظریے

اکائی 3 اُردو زبان کا ارتقا: پایۂ تخت کی تبدیلی کے اثرات

اکائی 4 دکنی اُردو کی لسانی خصوصیات

اکائی 5 لسانیات کا مفہوم۔ مصوتے و مصمتے

اکائی 6 اُردو املا کے مسائل اور صحتِ املا کی جدید سفارشیں

اکائی 7 اُردو کی ابتدائی نشو ونما میں صوفیاء کرام کی خدمات

اکائی 8 بہمنی دور میں اُردو ادب

اکائی 9 قطب شاہی دور میں اُردو ادب

اکائی 10 عادل شاہی دور میں اُردو ادب

اکائی 11 ولی اور سراج کے عہد میں اُردو شاعری

اکائی 12 شمالی ہند میں اُردو شاعری

اکائی 13 فورٹ ولیم کالج سے پہلے اُردو نثر

اکائی 14 دہلی کا دبستان شاعری

حصہ دوم

اکائی 15 فورٹ ولیم کالج کی ادبی خدمات

اکائی 16 فورٹ سینٹ جارج کالج کی اردو خدمات

اکائی 17 دلی کالج کی اُردو خدمات

اکائی 18 اردو شاعری کا دبستان لکھنؤ

اکائی 19 نظیر اکبر آبادی۔ ہندوستانی تہذیب کا نمائندہ

اکائی 20 اردو شاعری۔ 1857ء کے بعد

اکائی 21 اردو نثر 1857ء کے بعد

اکائی 22 انجمنِ پنجاب کی تحریک

اکائی 23 علی گڑھ تحریک

اکائی 24 اردو شاعری عہد اقبال میں

اکائی 25 اردو نثر عہد اقبال میں

اکائی 26 بیسویں صدی کے چند اہم تصنیفی اور تعلیمی ادارے

اکائی 27 ترقی پسند تحریک

اکائی 28 حلقہ اربابِ ذوق

اکائی 29 جدیدیت اور اردو شاعری

اکائی 30 جدیدیت اور اردو نثر

BOOK NO 095